ندی
عبداللہ حسین

ندی

عبداللہ حسین

ناشر
نصرت پبلشرز
حیدری مارکیٹ - امین آباد
لکھنؤ - ۲۲۶۰۱۸

اس کتاب کی اشاعت کی اجازت ڈاکٹر صادق اور ڈاکٹر عتیق اللہ
کے ذریعہ حاصل ہوئی

ہندستان میں اشاعت اول ۱۹۸۴ء

طباعت : نظامی پریس

قیمت : ۹ روپے

ابھی ابھی بائرن کا خط آیا ہے اور مجھے ساری بات یاد آ گئی ہے۔ دو برس پہلے کی بات جو اب بھولتی جا رہی ہے۔

وقت کا ظلم اس طرح سے ہمارے ذہن کی تسخیر کرتا ہے اور اس طرح دل کی منزل کا پتا گم ہوتا ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ منزلوں کا کوچ ہے جو فراموشی کی طرف رواں ہے اور یہ ہماری یاد کی رحم دلی ہے کہ منزل منزل پر ہمارا ساتھ چھوڑتی رہتی ہے۔ سارے وقتوں کی یاد کو لے کر ہم نہ چل سکتے ہیں نہ مستقبل کے اندھیروں میں شریک ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ خزاں کی بڑی پُرامن اور شفاف سہ پہر ہے اور میں اپنے گھر کے سامنے ندی کے پُل پر بیٹھا ہوں۔ گھر کے برآمدے میں مجھے وہ میز نظر

آ رہی ہے جس پر صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے تمام خط پڑے ہیں سوائے
اس ایک خط کے جو میں نے تہہ کر کے قمیص کی جیب میں رکھ لیا ہے
اور بار بار سینے پر ہاتھ پھیر کر قمیص کے اندر نفیس کاغذ کی سرسراہٹ
کو محسوس کر رہا ہوں اور اسے دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں مگر نہیں پڑھ
سکتا کیوں کہ خزاں کی زرد دھوپ میں بڑا امن ہے، اور پانی کے بہنے میں
اور دُور دُور تک ندی میں خشک پتے گراتے ہوئے زرد درختوں میں اور
درختوں کے بیچ ٹھمی ہوئی ہوا میں اور نیچے زرد رنگ کے کھیت میں ہل
چلاتے ہوئے کسان میں ایک ایسا پر سکوت، پر امن سحر ہے جو صرف خزاں
کے موسم میں ہوتا ہے کہ سہ پہر کے وقت میں ہوتا ہے اور جس میں کسی
بدامنی کی خلل اندازی کی ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے۔ وہ کون تھا جس نے
کہا تھا کہ دنیا کا سب سے رقت انگیز، سب سے دل گداز منظر کسان کے زمین میں
ہل چلانے کا ہے۔ غالباً کوئی مصوّر تھا۔ میں ایک بار پھر خط کو سینے کی جیب
میں محسوس کرتا ہوں۔ میرے عین نیچے پانی میں دور دراز کے منظر، گمشدہ
محبوب چہرے بہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ وقت کا تلاطم تھمتا جا رہا ہے۔
ندی، میری عزیز دوست، اب میں تم سے مخاطب ہوتا ہوں۔

مغربی کینیڈا کی اس چھوٹی سی یونی ورسٹی میں پہنچتے ہوئے مجھے دوسرا

دن تھا۔ سارا وقت بارش ہوتی رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت ذرا سی
بارش تھمی اور بادل پھٹ گئے۔ میں اکتا کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ڈھلی
ڈھلائی ہوئی سیمنٹ کی کشادہ سڑکوں پر کہیں کہیں موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں
جن کی چھتوں پر میپل (maple) کے زرد اور قرمزی پتے گرے
ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کار کے انجن پر چند لڑکے جھکے ہوئے تھے۔
انھوں نے سر اٹھا کر اپنے مخصوص دوستانہ لہجے میں ہلو کیا۔ آگے لڑکیوں
کا ہوسٹل تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی چند لڑکیوں نے مجھے ناقدانہ نظروں
سے دیکھا۔ آگے یونی ورسٹی کا گرجا تھا جس میں سے نکلتے ہوئے نوجوان پادری
نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال کا بوڑھا بیرا جم ووڈکا
کی ایک خالی بوتل ہاتھ میں لٹکائے چلا آتا تھا۔ اس نے پائپ منھ سے
نکالے بغیر میرا حال پوچھا اور گزر گیا۔ کیمپس پر ڈین کے علاوہ بھی ایک
شخص تھا جس سے اب تک میری واقفیت ہو سکی تھی۔ سردی یک لخت
بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے زور سے میپل اور پائن کے درختوں پر رکے ہوئے
بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں نے سردی سے بچنے کے لیے
کوٹ کا کالر اٹھایا اور کامن روم کی طرف چلا گیا جو شام تک کھلا رہتا تھا۔
کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اور باہر بارش پھر شروع ہو گئی
تھی۔ میں سبز رنگ کے بے آواز قالین پر ادھر ادھر پھرتا اور کتابوں پر نظر

ڈالتا رہا۔ میزوں پر اخبار اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔ ہال میں کتابوں اور میزوں اور کرسیوں کی مخصوص بُو رکی ہوئی تھی۔ جیبوں سے ہاتھ نکالے بغیر میں نے چند رسالوں کے سرورق دیکھے، ایک میز پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا ارادہ کیا، پھر دل ہی دل میں اس خیال کے بے ڈھنگے پن پر ہنسا اور ایک بڑے سے دریچے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ بند شیشوں پر سر مارتے ہوئے بارش کے قطرے ہلکی ہلکی کند آواز پیدا کر رہے تھے۔ پرے بیل کے درختوں پر سے زرد اور سُرخ اور سرمئی پتے، جن کا وقت پورا ہو چکا تھا بھاری تعداد میں نیچے آ رہے تھے اور بارش کے پانی میں تیر رہے تھے اور بہہ رہے تھے اور چیکر کھا رہے تھے۔ پرے گرجا گھر کی مخروطی چھت آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ پرے سیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس سے پرے کہیں میرا وطن تھا، کئی ہزار میل پرے میں نے سوچا بیچ میں سمندر پڑتے تھے۔

"بند دریچوں کے باہر بارش بڑی عجیب لگتی ہے"۔ کسی نے کہا۔

بہت آہستہ آہستہ میں اپنی سوچ میں سے نکل آیا۔ چند لحظے تک آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑے رہنے کے بعد میں چونک کر مڑا۔ یہ ایک لڑکی تھی جو میری طرف پشت کیے ایک رسالے پر جھکی ہوئی تھی۔ بظاہر اس نے یہ الفاظ اپنے آگے پڑے ہوئے پرچے سے مخاطب ہو کر کہے تھے، اس نے سرخ رنگ کی بھاری سی اونی سویٹر پہنی ہوئی تھی اور آنکھوں

پر پڑھنے کا چشمہ چڑھا رکھا تھا۔

"مجھے یوں لگتا ہے" جھکے جھکے اس نے کہنا شروع کیا، پھر وہ مڑی اور سیدھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی" جیسے کوئی راہ گیر ناگہانی آنکلا ہو اور ہمارے دروازے پر کھڑا اڈری ڈری دستک دے رہا ہو۔"

"کھوں ہوں" میں نے گلے میں سے ملی جلی تائیدی آواز نکالی اُس کی آنکھیں اور بال شہد کے رنگ کے تھے۔

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ تمہیں بھی ایسا لگتا ہے؟"

"مجھے؟" جواب کی تلاش میں، میں نے دوبارہ حلق سے غیر یقینی مگر شائستہ آواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں ــــ"

"ٹھہرو ٹھہرو۔ وہ بات کاٹ کر بولی" مجھے بوجھنے دو

"اول ہینگ!"

"نہیں؟" وہ اداس ہو گئی" اسپین سے تمھاری طرح کے لوگ آتے ہیں۔ اسپین سے میرو بھی آیا تھا۔ دو سال ہوئے۔ میری اس کی بڑی دوستی تھی۔"

"پھر۔؟"

"اب وہ جا چکا ہے۔ بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟"

"کسی اور ملک کا نام لو۔"

"نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم اسپین سے تو نہیں آئے بتاؤ۔"

میں نے اسے اپنے ملک کا پتا بتایا۔

"میرا نام بلانکا ہے۔" وہ پھر مڑ کر بیٹھ گئی۔ "میں ماہر لسانیات ہوں۔" اُس نے خوش دلی سے کہا اور اس کے سفید ہموار دانت ہنسی میں کھل گئے "یعنی یہ کہ میں لسانیات کی طالب علم ہوں۔ سینیئر۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اپنا نام بتایا، اور یہ کہ فزکس میں ریسرچ کرنے یہاں آیا ہوں۔"

"ریسرچ اسکالر؟" اس نے بھویں اٹھائیں "مشکل سے تو تم جغرافیے کے جونیئر دکھائی دیتے ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "خیر فزکس بھی بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ مگر لسانیات کی کیا بات ہے۔ اب اسی رسالے کو لے لو۔ اس کے سر پیر کا علم بھی تم نہیں رکھتے۔ رکھتے ہو؟"

میں نے قریب جا کر سنجیدگی سے اس اجنبی زبان کے حروف کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ ہنس پڑی۔

"کبھی نہیں۔ یہ روسی ہے۔ میں روسی، ہسپانوی اور لاطینی پڑھ رہی

ہوں۔ ہسپانوی میرا خاص مضمون ہے۔ میرے وسے میں ہر وقت ہسپانوی بولا کرتی تھی۔"

"اب روسی کس سے بولتی ہو؟" میں نے کہا۔

"صرف اپنے پروفیسر سے۔ یہ بڑی مشکل زبان ہے پر بڑی خوبصورت ہے۔ ابھی ابھی میں پیٹرووسکی کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ اگلے سال روس جا کر ریسرچ کروں گی۔ میں روس جانا چاہتی ہوں۔ ماسکو۔ اس شہر میں ایسا اسرار ہے۔ زار کا اور راس پوٹن کا ماسکو، ٹالسٹائی کا اور دوستوفسکی کا اور نجنسکی اور ماباکووسکی اور پاسترنک کا ماسکو۔ اس شہر کا ایک کیریکٹر ہے" اپنی جگہ پر الگ اور انوکھا اور برگزیدہ اور پرکشش جیسے پیرس کا اور روم آنا کا کیریکٹر ہے۔ ان جگہوں کا نام آتے ہی داستانیں جاگ پڑتی ہیں۔ نیویارک یہاں سے چند سو میل کے فاصلے پر ہے لیکن وہاں جانے کا خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا ہو سکتا ہے کہ اگر میں وہاں جاؤں تو اس کی وسعت اور گراں ڈیل پن سے مرعوب ہو جاؤں لیکن باہر سے میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ میں شاید کبھی نیویارک نہ جاؤں۔ میں روس جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی روس جانا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

" اوہ ۔۔۔" وہ چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے بولی "تم مشرق

کے رہنے والے اتنے جذباتی ہوتے ہو"

"میں جنوب مشرقی ایشیا کا رہنے والا ہوں" میں نے فخر سے اسے بتایا۔

"گوہسپانوی بھی بڑے جذباتی ہوتے ہیں" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تمہیں اسپین سے عشق ہے؟"

"نہیں ـــ" وہ پھر اداس ہوگئی" لیکن میرو سے میرا بڑا بھائی چارہ تھا"

"بھائی چارہ؟"

"کیمپس پر تم کس کس سے ملے ہو؟" اس نے دفعتاً موضوع تبدیل کر دیا۔

میں نے اسے بتایا کہ سوائے ڈین آف دی فیکلٹی آف سائنس کے، جس نے کہ آج رات مجھے کھانے پر بلا رکھا ہے اور کھانا کھلانے والے بوڑھے جم کے میں اور کسی کو نہیں جانتا۔

"چلو اچھا ہوا کہ تم اِدھر آگئے اور مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ میں بڑے کام کی آدمی ہوں" وہ پھر خوش دلی سے باتیں کرنے لگی"یونیورسٹی کے ایک گروہ میں میں سخت غیر مقبول ہوں اور دوسرے گروہ میں بے حد

ہر دلعزیز ہوں۔ قصّہ مختصر یہ کہ کیمپس بھر میں شیطان کی طرح مشہور ہوں۔ سارا اسٹاف مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے کیونکہ میں بے حد ذہین ہوں۔ تمہیں مجھ سے مل کر بیحد خوشی ہوگی۔ میری شخصیت بڑی زنگار رنگ ہے۔" اس نے عینک چڑھا کر مسخرے پن سے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

خفیف سی بوکھلاہٹ کے باوجود میں بھی اس کے ساتھ جی کھول کر ہنسا۔ جب ہم ہنستے ہنستے رکے تو ساری اجنبیت دور ہو چکی تھی۔ میں نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ مجھے یونی ورسٹی کی ساری تاریخ، ٹرم کی ساری مصروفیات اور دلچسپیوں کے بارے میں بتلاتی رہی۔ میں نے اسے اپنے ملک کے حالات اور اپنی طالب علمی کے زمانے کے چند قصّے سنائے جن کو اس نے گہری دلچسپی سے سُنا۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ لیکن کمرے میں سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے ہلکی ہلکی حرارت تھی اور اس وقت اس کے قریب بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے مجھے عجیب سے ذہنی سکون اور فراغت کا احساس ہوا۔ اس نے ہلکے مزاحیہ انداز میں اپنے قریبی دوستوں، ان کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور راحتوں اور ان کے مسخرے پن کی حرکتوں کا ذکر کیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ دفعتاً اداس ہو جاتی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔ اس ایک گھنٹے میں میں نے اس کے چہرے کو کئی بار اُترتے اور چڑھتے ہوئے اور اس کی آنکھوں کو کئی بار رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ (پینتے دیکھتے آخر)

باہر جب اندھیرا بڑھ گیا اور بارش تھم گئی تو وہ کندھے جھٹک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چلو چلیں۔"

جب میں کھونٹی سے کوٹ اتار کر پہن رہا تھا تو بالکل بھول چکا تھا کہ یہاں آئے ہوئے مجھے ابھی دوسرا دن ہے اور اس جگہ میں قریب قریب مکمل اجنبی ہوں۔

"بیچارے پیٹرودسکی کی کہانی۔" وہ روسی رسالہ بند کرتے ہوئے بولی۔ اخبار اور رسالے سمیٹ کر ترتیب وار رکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ کامن روم کا منتظم چونکہ ابھی تک نہیں پہنچا اس لیے ڈین نے چار لڑکیوں کی ایک ایک دن کے لیے ڈیوٹی لگا دی ہے۔

"آج میری ڈیوٹی تھی۔ کمبخت سب لوگ کہیں مر گئے ہیں۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ سارا دن میں بڑی محنت سے اخباروں کو بے ترتیبی سے پھیلاتی رہی، جیسے کہ ابھی ابھی بہت سے لوگ یہاں سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ تمہیں کچھ پتا چلا؟"

"تم بڑی مکار ہو۔" میں نے کہا۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

دروازے میں چابی گھماتے ہوئے اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا "تم نہیں جانتے کہ یہ ڈین جنکنز سخت کمینہ آدمی ہے۔" برآمدے کی سیڑھیوں

پہ رک کر اُس نے احتیاط سے بالوں پر سرخ اسکارف باندھا، چہرے پر
بارش کی مہین پھوار کو محسوس کیا اور ایک مختصر سا، گہرا، جذباتی قہقہہ لگایا۔
" یہاں کی آب و ہوا کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں یہاں
پر شاید تم نے نوٹ نہیں کیا، چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جن پر اکثر بارش
ہوتی رہتی ہے اور جب خزاں کی پہلی بارش ہوتی ہے تو موسم یک لخت
بدل جاتا ہے اور سردی بڑھ جاتی ہے اور میپلوں کے رہے سہے پتے بھی
گر جاتے ہیں اور انسان کے دل میں فضا میں اڑنے کی خواہش پیدا ہوتی
ہے ..... اس طرح .... اگر میرے پر ہوتے، اگر میرے پر ہوتے
تو میں اڑ کر اُس شاخ پر جا بیٹھتی جہاں سے ابھی ابھی پتے گرے
ہیں " اس طرح، اس طرح " اس نے پرندے کی طرح بازو ہوا میں
پھیلائے اور دوبارہ منہ اوپر اٹھا کر آنکھیں بند کر کے ہنسی۔
شام کی ملگجی روشنی میں اُس کی جلد میں سے روشنی اور خوشبو کی
لپٹیں نکل رہی تھیں اور اس کی خوبصورت پیشانی پر خوشی کا نور تھا۔
اور اس کے دانت سفید ~~ہیروں~~ موتی کی طرح چمک رہے تھے اور اسکارف
میں سے نکلی ہوئی اس کے بالوں کی لٹ میری ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔

" تم بڑی خوبصورت ہو " میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔

اس کے پھیلے ہوئے بازو آہستہ آہستہ نیچے آگرے۔ "اچھا؟" اس نے پوچھا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ میری طرف رُخ کر کے کھڑی ہو گئی اور چہرہ اوپر اٹھا کر بولی "مجھے چومو۔"

پریشانی کے مارے میری آنکھیں جھپکنے لگا۔

"چومو۔" اُس نے تقریباً درشتی سے کہا۔

میں نے جھک کر آہستہ سے اسے پیشانی پر چوما۔

"بس؟" اس نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔" وہ رسان سے بولی۔ "ساری دنیا کی دوستی اور رفاقت کے بعد بھی مردوں کے دل میں ایک خواہش باقی رہ جاتی ہے عورت کو مجبور کرنے کی، یا نبذ کرنے کی خواہش، اور ان کے پاس تخیل کی اس قدر شدید کمی ہوتی ہے کہ دنیا جہان کے مسلوں کے بعد اسی بات پر آکر ان کی تان ٹوٹتی ہے" تم بڑی خوبصورت ہو۔" اس کے بعد عورت کے دل میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کمزوری پیدا ہوتی اور رقیب پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ محبوبہ بن سکتی ہے، دکھ

سہہ سکتی ہے اور نہ کوئی برداشت کر سکتی ہے لیکن دوستی نہیں کر سکتی۔ اور مجھے
افسوس ہے سلطان حسین کہ میں صرف دوستی کر سکتی ہوں۔ بس! اب
ٹھیک ہو گیا نا سلطان حسین! تمہارے سارے بکھیڑے میں نے آن واحد
میں ختم کر دیے ہیں۔ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ اب ہم پھر برابر کی
سطح پر آ گئے ہیں۔ اب نہ تمہیں مزید بننے کی ضرورت ہے نہ مجھے۔ اب
ہم دونوں آزاد ہیں۔ تم جہاں چاہو، جس وقت چاہو بغیر جھجک گھوم سکتے ہو
اور آزاد ہو سکتے ہو۔ سمجھ گئے؟"

میں خاموش کھڑا خفت اور برہمی کی وجہ سے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس
کا چہرہ اُتر گیا۔

"انہی باتوں کی وجہ سے میں لڑکوں کی اکثریت میں غیر مقبول ہوں
بلکہ بدنام ہوں۔ لیکن جو میرے دوست ہیں بڑے عزیز دوست ہیں۔
اب تمہاری مرضی ہے جس گروپ میں چاہو شامل ہو جاؤ   چلو۔"
وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتری۔
تاریک پھوار میں بھیگتے اور سڑک پر جگہ جگہ رکے ہوئے پانی کو پھلانگتے
ہوئے وہ پھر اپنے ہلکے تمسخرانہ لہجے میں باتیں کرنے لگی "ارے میں نے اپنے
ذاتی کارنامے تو تمہیں بتائے ہی نہیں۔ پہلے سال میں نے دلستے کی پھیرجس
پر ایک مضمون لکھا تھا جو بڑا مشہور ہوا اور جس پر سال کے بہترین مضمون کا

انعام مجھ کو دیا گیا اور جو یونی ورسٹی پریس نے کتابی صورت میں شائع کیا اور جس کا ترجمہ میرو نے ہسپانوی میں کیا اور میڈرڈ کے ایک پبلشر کو بھیجا جو سخت کمینہ نکلا اور اسے صاف ہضم کر گیا۔ بہر حال بڑا معرکتہ الآرا مضمون ہے تمہیں دوں گی اسے پڑھنا۔ تمہاری ذہنی تربیت کے لیے مفید ثابت ہوگا!" وہ ہنسی "اور تم آج ڈین کے ہاں کھانے پر جا رہے ہو، مجھ سے چند ٹپ لے لو، بڑے فائدے میں رہو گے۔ یہ ڈین رچرڈس بڑا کمینہ ہے مجھ سے سخت نفرت کرتا ہے، کبھی کسی کو کھانے پر نہیں بلاتا۔ تم چونکہ ایشیا سے ـــ معاف کرنا جنوب مشرقی ایشیا سے پہلے طالب علم آئے ہو اس لیے ـــ لیکن تم نے اگر اس کے کتے کی تعریف کر دی تو سمجھ لو کہ بیڑا پار ہو گیا اس کے دروازے پر ایک ہاتھی نما جانور ملے گا۔ یہ سینٹ برنارڈ ہے۔ تم اس سے بالکل مت ڈرنا، بڑا غبی، کاہل اور نکما کتا ہے لیکن اس کی تعریف کرنا مت بھولنا۔ اور برڈ واچنگ (Bird Watching) ڈین رچرڈس کی ہابی ہے اس میں بے حد دلچسپی کا اظہار کرنا ورنہ وہ سخت بُرا مانے گا۔ یہ باتیں اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو۔"

"تم نے کہا کہ وہ تم سے نفرت کرتا ہے" میں نے پوچھا۔

"ارے ہاں، وہ یوں ہوا کہ پچھلے "کرسمس بال" کے خاتمے پر رات کے گیارہ بجے جب ہم جیکسن ہال سے نکلے تو لڑکوں کے اصرار پر چوری چھپے

ان کے ہوسٹل چلے گئے اور لونج میں رقص کرنے لگے۔ انھوں نے دیوار پر نیوڈ (Nude) ٹانگ رکھی تھی۔ رات کا ایک بجا ہوگا کہ ڈین رچرڈس کو کسی نے خبر کر دی۔ تمہیں پتا ہے کہ لڑکوں کے ہوسٹل میں ہمارا جانا منع ہے خیر ہمیں وقت سے اطلاع مل گئی اور ہم میں سے چند تو صوفوں کے پیچھے چھپ گئیں اور جو باہر رہ گئیں وہ ترتیب سے کھڑی ہو کر کیرل (کرسمس کے بارے میں مذہبی گیت) گانے لگیں۔ جب ڈین ہمارے سر پر چڑھ آیا تو ہم نے معصومیت سے اسے بتایا کہ ہم تو کیرل گاتی ہوئی یہاں سے گزر رہی تھیں۔ خیر جناب، ہم زور زور سے گاتے ہوئے باہر نکل آئے اندر ڈین کی نظر نیوڈ پر جا پڑی۔ پھر تو وہ پانچ منٹ تک لال پیلا ہو کر گرجتا رہا اور جاتی دفعہ تصویر اتار کر لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم ہوبرٹنک میزوں پر بیٹھے پیتے اور بور ہوتے رہے۔ پھر کسی نے کہا کہ ڈین رچرڈس کا کارٹون بنایا جائے۔ یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور مجھے کارٹون بنانا پڑا جسے ہم نیوڈ کی جگہ لٹکا کر اپنے ہوسٹل واپس آ گئے۔ لیکن صبح کو کسی بے وقوف نالائق چوہے نے جا کر اسے بتا دیا کہ رات اس کے جانے کے بعد ہم پھر وہاں پر موجود تھے اور یہ کہ ہلا آکاو کمر نے اس کا کارٹون بنا کر دیوار پر ٹانگا ہے۔ وہ خود اسے دیکھنے کے لیے وہاں آیا۔ اس دن سے لے کر وہ مجھ سے سخت جلا ہوا ہے لیکن میں اس

کی پہنچ سے باہر ہوں۔ ڈین جنکنز مجھے بہت اچھا جانتا ہے۔ تم بہرحال اپنی خیر چاہتے ہو تو اسے مت بتانا کہ آج شام تمہاری ملاقات مجھ سے ہوئی۔ یہ دیکھو، ہمارا گرجا ہے، کسی روز اندر سے چل کر تمہیں دکھاؤں گی۔ یہ فیکٹری ہے جہاں ہم دن میں تین بار زہر کھانے کے لیے جمع ہوتے ہیں پرسوں بائرن آ جائے گا، اس سے ملنا۔ ایک دم ڈیوائن ڈارلنگ آدمی ہے۔ اچھا میری سرائے آ گئی، پھر ملاقات ہوگی۔ شب بخیر ــــ"

*

ٹرم شروع ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ میں دن بھر اپنے پروفیسر کے ساتھ لیبارٹریوں میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ شام کو تھک ہار کر لوٹا، کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھانے گیا اور واپس آ کر بیلی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"بھائی جان مجھے ساری جگہوں کی اور سارے لوگوں کی ساری باتیں لکھیے گا۔ اچھا؟" جب میں گھر سے چل رہا تھا تو اس نے اپنا چھوٹا سا منہ اٹھا کر کہا تھا۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ باہر اک شور سنائی دیا۔ اس شور میں تیز، باریک نسوانی چیخوں کی آوازیں تھیں۔ میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر باہر نکل آیا۔ سڑک کے دو رویہ لڑکے کھڑے تھے دور سے مشعلوں کا جلوس چلا آ رہا تھا۔ جب قریب آیا تو

میں نے عجیب منظر دیکھا۔ سو ڈیڑھ سو لڑکیاں شب خوابی کے لباس میں ملبوس عجیب افراتفری کے عالم میں بھیڑوں کے گلّے کی طرح ایک دوسرے سے لگی ہوئی بوکھلائے ہوئے چہروں کے ساتھ چلی آرہی تھیں، بھاگ رہی تھیں، رک رہی تھیں، لڑکھڑا رہی تھیں، گریبانوں کو سمیٹ رہی تھیں، جسم چرا رہی تھیں، بالوں کو سنوار رہی تھیں، سردی سے کپکپا رہی تھیں، چیخیں مار رہی تھیں، رو رہی تھیں اور خجالت سے ہنس رہی تھیں۔ ان کے گرداگرد سینئر لڑکیوں کا حلقہ تھا جو ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ان کو ہنکائے لیے جا رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لڑکوں کا مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک مشعل کی روشنی میں میں نے بلانکا کو پہچانا بائرن مجھے بتا رہا تھا۔

"یہ فراش (پہلے سال کی لڑکیاں: FROSH) کا "پاجامہ جلوس" ہے۔ یہاں کی بڑی پرانی روایت ہے۔ بچاری نئی نئی آتی ہیں پہلے ایک دو روز تک سینئر لڑکیاں داروغہ بنی ہوئی انھیں ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہیں۔ جب انھیں دنیا کی مجموعی اچھائی پر یقین ہونے لگتا ہے تو ایک رات کو جب وہ بستروں میں گھس کر سونے کی کوشش کر رہی ہوتی ہیں آگ آگ کا شور مچا کر ان کو اسی حالت میں باہر نکال لیا جاتا ہے اور سارے کیمپس پر ہانکا جاتا ہے۔ کئی لڑکیاں اس کے بعد

صدمے کی وجہ سے کئی روز تک کلاسوں میں نہیں جا سکتیں. قاعدے کی
رو سے صرف دوسرے سال کی لڑکیاں اس چھوٹی سی کیمنگی میں حصّہ لیتی
ہیں مگر بلانکا ہر سال ان میں شریک ہو جاتی ہے. پروفیسر اس بات
کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے. ساتھ میں جین کو بھی کھینچ کر لے جاتی ہے
وہ جین ہے. وہ دیکھو بلانکا کے پیچھے. لائبریری سائنس پڑھ رہی ہے.
یہاں سے فارغ ہو کر ہم شادی کر رہے ہیں."

جلوس کے گزر جانے کے بعد ہم دیر تک سڑک پر کھڑے باتیں
کرتے رہے. آسمان پر بڑا سا چاند نکلا ہوا تھا. خزاں کی بڑی خنک،
شفاف، شیشے کی طرح کھڑکھڑاتی ہوئی رات تھی. میپل کی پتے ہمارے
بالوں پر گر رہے تھے. بائرن سے میں چار روز پہلے ملا تھا. اکنامکس
کا پوسٹ گریجویٹ تھا اور بلانکا کے بہترین دوستوں میں تھا. بڑا
سلجھا ہوا، خوش شکل، ٹھوس قسم کا نوجوان تھا. اس کے والدین آئرلینڈ
سے آکر کینیڈا میں بس گئے تھے. ڈبلن کا، جو اسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا،
ابھی تک بڑے پیار، بڑی اداسی سے ذکر کرتا تھا، جس طرح ہم سب اپنے
بچپن کی خواب ناک، خوب صورت، جگہوں کو پیار اور اداسی سے یاد کرتے
ہیں. لیکن اُس رات سڑک کے کنارے رک کر اُس سے باتیں کرتے
ہوئے میرے دل میں نوجوانی کا اوّلین زور تھا اور میں اس بات سے

سے بے خبر تھا کہ ساری اچھائی اور ساری نوجوانی اور ساری خوب صورتی کہانیوں کی طرح ہمارے خوابوں میں اور گمشدہ محبوب چہروں میں اور پارسال کے گرے ہوئے پتوں میں اور گزرے ہوئے وقت میں رہ جاتی ہے اور کبھی کبھار بہتے ہوئے پانی میں دیکھنے پر اور دیکھتے رہنے پر کہیں کہیں سے ابھرتی آتی ہے، ڈوب جاتی ہے۔

مہینے کے وسط میں "خزاں کے رقص" کا موقع آیا۔ بائرن نے مجھ سے کہا "کیوں نہیں تم بلانکا سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتے"۔

"پتہ نہیں وہ جائے یا نہ جائے" میں نے کہا "اور پھر مجھے ناچنا واچنا تو آتا ہی نہیں"۔

"جہاں تک مجھے علم ہے وہ کسی ایک لڑکے میں آج کل دلچسپی نہیں لے رہی۔ تم پوچھ کر تو دیکھو" بائرن نے کہا۔

میں نے فون کیا۔ بلانکا نے معذرت کرتے ہوئے کہا وہ ایک اور لڑکے کے ساتھ جانے کا وعدہ کر چکی ہے اور یہ کہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرا اس کی طرف خیال ہے ورنہ وہ ضرور میرے ساتھ جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

بائرن کندھے اچکا کر لاپروائی سے ہنسا "کوئی بات نہیں میں تمہارے لیے لڑکی کا انتظام کرتا ہوں"۔

لیکن شام سے پہلے پہلے بلانکا کا فون آگیا "سلطان آف دی ساؤتھ ایسٹ ایشیا، تمہارے لیے میں نے ایک کوئین تلاش کرلی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی "اب انکار مت کرنا، پہلے سال کی بڑی ہی خوبصورت اور نازک مزاج لڑکی ہے۔ کل ہال جانے سے پہلے اسے ہوسٹل کی سیڑھیوں پر سے لے لینا، اس کے لمبے لمبے سیاہ بال ہیں، تعارف خود ہی کرلینا۔ ازا بلا اس کا نام ہے۔

مغربی کینیڈا کے جنگلوں میں خزاں کے ہزاروں رنگ ہوتے ہیں گرنے سے پہلے پتے زرد، سرخ، سیاہ، سبھی رنگ بدلتے ہیں جبکیسن ہال میں خزاں کے رقص کی شام کو ان سارے رنگوں کی کاغذی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور برقی قمقمے روشن تھے۔ ہال کے چکنے فرش پر آدھ گھنٹے تک ازا بلا مجھے بال روم ڈانسنگ کے ابتدائی گر سمجھاتی رہی۔ پھر ہم تھک کر بیٹھ گئے اور ہلکی پھلکی گفتگو کی سعی شروع کی۔ اس کے لچھے دار سیاہ بال تھے اور براؤن آنکھیں تھیں اور چہرے پر تل ہی تل تھے اور سیدھا سادا جسم تھا۔ انگریزی ادب پڑھ رہی تھی۔ اگر اس میں دلربائی ذرا زیادہ ہوتی تو پُرکشش ہوسکتی تھی لیکن وہ بڑی سنجیدہ اور مخلص لڑکی تھی اور انگریزی ادب کے سوا اسے کچھ نہ آتا تھا، جس سے مجھے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، چنانچہ گفتگو زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔

جلد ہی ہم اپنے اپنے مشروبات کے گلاس تھامے کونے کی میز پر بیٹھے ہال میں اوٹ پٹانگ ناچ ناچتے ہوئے قہقہے لگاتے اور گاتے ہوئے جوڑوں اور چھوٹے چھوٹے گروپوں کو اُکتاہٹ سے دیکھنے لگے۔ دو ایک بار بائرن جین کے ساتھ رقص کرتا ہوا پاس سے گزرا۔ ازابلا سے رقص کی درخواست کرنے اور کوئی لڑکا ابھی تک نہ آیا تھا مگر وہ مطمئن تھی، کیونکہ وہ پہلے سال کی اُن چند لڑکیوں میں سے تھی جو باقاعدہ طور پر کسی مرد کے ہمراہ آئی تھیں۔ خزاں کا رقص فرش کے لیے عام تعارف کا موقع بھی ہوتا ہے، چنانچہ اُن میں سے زیادہ تر اکیلی آئی تھیں اور دو دو چار چار کر کے دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑی تھیں اسی طرح پہلے سال کے لڑکے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بیٹھے تھے اور انھیں تاک رہے تھے۔ جب کسی پُرشور رقص کی دھن اندھا دھند بجنے لگتی تو وہ ایک ساتھ اُٹھتے، مجموعی جرأت کے بل پر آگے بڑھتے، سرخ ہو ہو کر منہ میں منمناتے اور جو لڑکی سامنے آجاتی اُس کے ساتھ ناچنے لگتے۔ میرے لیے یہ منظر مجموعی طور پر بڑا مزاحیہ تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر زیادہ تر جوڑے تشکیل پا چکے تھے اور نئی دوستی کے جوش میں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ میں ازابلا سے گفتگو شروع کرنے کی ایک آخری کوشش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے

پر ہاتھ رکھا "میں آپ کے ساتھ رقص کی سعادت حاصل کر سکتی ہوں"
بلان کانے نیم تمسخر، نیم سنجیدگی سے پوچھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ
گیا۔ اس کے بال چمکتے ہوئے سنہرے رنگ کے تھے۔ چند لحظے تک گھبراہٹ
میں آنکھیں جھپکتے رہنے کے بعد میں ازا بلا سے رسمی طور پر اجازت
لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم ہال کے فرش پر آ گئے۔

"گنواروں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھو۔ بالوں کو رنگ
کروانا میری ہابی ہے"۔ رقص کرتے ہوئے وہ بولی۔

"اچھا؟"

"کاش کہ آنکھوں کا رنگ بدلوانے کا بھی کوئی طریقہ نکل آتا تو
میں انھیں بھی رنگواتی"۔

"تمہارے بالوں کا اصل رنگ اچھا ہے"۔

"اوہ، سخت غلطی ہو گئی۔ تم سے پوچھے بغیر میں نے ایسی نازیبا
حرکت کر دی۔ اچھا معاف کر دو، اگلی بار تم سے لکھ کر اجازت نامہ
حاصل کر لوں گی"۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا" میں نے کہا۔

"اور کیا مطلب تھا؟" وہ بڑے یقین، بڑی لاپروائی سے بولی
"اچھا خاصا ناچ لیتے ہو"۔

"ابھی ابھی ازابلا سے سبق حاصل کیا ہے۔

"ازابلا؟" ارے ہاں تم نے بتایا ہی نہیں، ازابلا پسند آئی؟"

"بہت۔"

"بڑی پیاری لڑکی ہے۔"

"بہت۔"

"بڑی ذہین ہے۔"

"بہت، بہت۔" میں نے جل کر کہا۔

ایک لمحے کو رک کر اس نے میری طرف دیکھا، پھر مجھے کھینچتی ہوئی کوریڈور میں لے گئی۔

"مجھ سے خفا ہو؟" برآمدے کی نیم تاریکی میں اس نے آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"مجھے چومنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔"

"ازابلا کو؟"

"نہیں، نہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"کیوں؟"

"ہماری طرف اس کا رواج نہیں ہے۔"

اس کا چہرہ اتر گیا" اسی لیے تم جذباتی ہو" وہ اداسی سے بولی" میرو بھی جذباتی تھا۔ تم لوگ، انھیں پیدا کرتے ہو۔ جذباتی آدمیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اسی لیے کہ تم خود جذباتی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے دہل کر میری طرف دیکھا، خفیف سا لڑکھڑائی۔ پھر سنبھل گئی۔ اندر رقص پورے شباب پر تھا۔ اونچی نیچی کھڑکیوں کے راستے ہال کی تیز روشنی کے ساتھ ساتھ باتوں اور قہقہے اور گھسٹتے ہوئے پیروں کا ملا جلا شور باہر آرہا تھا۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑی تیز تیز پلکیں جھپکا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی وہ غیر قدرتی چمک، وہ مسکراتا ہوا تمسخر لوٹ آیا جس سے وہ ساری دنیا کا، ساری انسانیت کا مذاق اڑاتی رہتی تھی، جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے پاگل کر دیا دفعتاً اس نے اُچک کر میری گردن میں ہاتھ ڈالا، سر نیچے کھینچ کر مجھے ہونٹوں پر چوما اور اندر بھاگ گئی۔

جب میں واپس آیا تو ازابلا غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اسے تلاش کرنے کی تکلیف نہ کی۔ اس شام کو مجھے صحیح طور پر پتہ چلا کہ بلا نکا لڑکوں میں کس حد تک مقبول تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے

ایک درجن بار اس کے ساتھ رقص کرنے کی کوشش کی. لیکن اوّل تو میں اس تک پہنچ ہی نہ پایا اور اگر کبھی چند قدم تک ناچ بھی لیا تو فوراً ہی کسی نے عقب سے آکر میرے کندھے کو ٹھوکا دینا شروع کر دیا اور مجھے ہر دفعہ بادل نخواستہ اس کا ہاتھ نو وارد لڑکے کے ہاتھ میں دے کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ازا بلا مستقل ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ ایک بار قریب سے گزرتے ہوئے رک کر اس نے اپنے ساتھی سے میرا تعارف کرایا۔ چھوٹے سے قد اور کھڑے کھڑے کانوں والا پہلے سال کا لڑکا خوردبینی شیشوں والی عینک کے نیچے خوشگواری سے مسکرایا۔ مجھے ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی. ناچ کی آخری، تیز، پرشور دھنیں بج رہی تھیں اور سینکڑوں تھکے ہوئے گھسٹتے ہوئے پاؤں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ پھر شام کا آخری والز ہوا۔ دھیما اور نرم اور پروقار اور مشکل اور رومانٹک ـــــ اس رقص کے ناچنے والوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں اور کوئی ناچ نہیں ہے۔ میرے دل میں ایک نامعلوم سا، بے وجہ غصّہ آہستہ آہستہ بل کھا رہا تھا۔ وقفے وقفے پر اس کو محسوس کر کے میں سخت متعجب ہوتا، اسے دبانے کی کوشش کرتا، پھر بھول جاتا۔ اس کی ہر دم مسکراتی ہوئی، طنز کرتی ہوئی، حقیر جانتی ہوئی آنکھوں میں، اس کی ہر دلعزیزی

میں، اس کی طبیعت کے ہرجائی میلان میں ایک گہرا سربستہ مشتعل کرنے والا، پاگل کر دینے والا اسرار تھا۔ اس کے متبسم ہونٹوں کے خم میں ایک خاموش حقارت تھی جو ہر ایک سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی "میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔ مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟"

شب بخیر کے شور میں کوٹ پہنے گئے۔ باہر رات سرد اور ویران اور خوشگوار تھی۔ موٹر گاڑیوں کے دروازے کھل رہے تھے، بند ہو رہے تھے، تھکی ہوئی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، کھل رہی تھیں۔ میں ازابلا کے بازو پر ہاتھ رکھے باہر نکلا۔ سڑک کے کنارے وہ اپنے گروہ کے ساتھ کھڑی تھی۔

"ہلو ملا لنکا۔ شب ۔۔" میں نے جسم چرا کر نکل جانا چاہا۔

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا "انسانوں سے اپنے آپ کو وابستہ مت کرو سلطان حسین، ورنہ انہی بھول بھلیوں میں رہ جاؤ گے آزادی اصل چیز ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا؟" میں نے بے خیالی سے چاروں طرف دیکھا۔ رات کے آخری قہقہے لگائے جا رہے تھے، رات کے آخری بوسے لیے جا رہے تھے، بوسے جو ٹیپل کے پتوں کی طرح ایک ایک کر کے یہیں گر پڑیں گے

قہقہے جو اس رات کی تاریکی میں منجمد ہو جائیں گے، جو ہمیشہ یاد آتے رہیں گے اور ہمیں مدتوں جوان رکھیں گے، جو کہیں دکھائی نہ دیں گے اور بہتے ہوئے پانی میں شامل ہو جائیں گے۔

"شب بخیر سلطان۔"

"شب بخیر بلانکا، شب بخیر ازا بلا۔"

"شب بخیر، بہت بہت شکریہ۔"

"تمہارا بھی شکریہ۔"

"شب بخیر، شب بخیر، شب بخیر۔"

میں اپنی پڑھائی میں پوری طرح مصروف ہو چکا تھا۔ دو ایک بار بلانکا سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملی۔ وہ ہر وقت اس قدر مصروف رہتی تھی۔ چھٹی کے دن سہ پہروں کو میں اور بائرن آس پاس کے جنگلوں میں لمبی لمبی سیروں کو جاتے۔ جنگل بڑے خاموش اور رنگین ہوتے تھے۔ انہی سہ پہروں میں مجھے پتا چلا کہ بائرن معاشیات کا طالب علم ہونے کے علاوہ چھوٹا موٹا فلسفی بھی ہے اور یہ کہ وہ مستقل جستجو میں ہے لیکن ابھی تک اپنے آپ کو تلاش نہیں کر پایا۔ انہی جنگلوں میں اس نے مجھ سے کہا:

"بلانکا بڑی ابنارمل لڑکی ہے۔ اتنی کامیابی سے اپنے آپ کو چھپائے

abnormal

رکھتی ہے کبھی کسی کو سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ اس کا آرٹ ہے۔ جو کچھ وہ کہتی ہے اور کرتی ہے اس کے بالکل برعکس اس کی زندگی ہے۔ ایک وقت تھا جب میں خود اس کے پیچھے خاصا دیوانہ ہو رہا تھا، لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس نے مجھ سے کہا "بائرن! تمہیں پتہ ہے ہم کتنے اچھے دوست ہو سکتے ہیں، صرف اگر تم یہ دیوانگی چھوڑ دو۔ تم اتنے پیارے آدمی ہو۔" اس کے بعد میں سنبھل گیا۔ اب وہ میری عزیز ترین دوست ہے لیکن کوئی شخص اس کے نزدیک جا کر اسے سمجھ نہیں سکتا۔ سب بیکار ہے۔

وہ خاموش، حسین جنگل اور دھوپیلی سہ پہریں اور آہستہ آہستہ جاگتا ہوا، مضبوط ہوتا ہوا احساسِ رقابت میری زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر بائرن اچانک چند دن کے لیے غائب ہو گیا۔ اتوار کے روز بلانکا کا فون آیا "سلطان! بائرن پر آرٹ کا دورہ پڑا ہے۔ وہ شہر میں اپنے کسی آرٹسٹ دوست کے ہاں چھپا ہوا ہے۔ مجھے بھی پتہ نہیں کہاں۔ صرف جین سے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی اس کی یہ آخری منزل ہے۔ ہٹ ہٹ ہٹ۔ بے چارہ ڈیوڈ فٹز جیرلڈ بائرن!"

میں نے اسے بعد دوپہر سیر کو چلنے کی دعوت دی جو اس نے

تھوڑے سے تامل کے بعد منظور کر لی۔ جنگل اسی طرح خاموش اور سحر آلود تھا اور چمکیلی دھوپ پتوں سے ڈھکے ہوئے راستوں پر پڑ رہی تھی۔ بلا ان کا مستقل باتیں کر رہی تھی، پچھلے چند روز کی مصروفیات کی باتیں اپنے بے مثل، ہلکے، تمسخرانہ، اداس لہجے میں۔

"یاد رکھنا بائرن ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو پالے گا، میرا یقین ہے۔ اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں کوئی کام کر سکے گا۔"

"تم لوگ اپنے آپ کو کیوں اتنا پُراسرار بنائے رکھنے پر مُصر ہو؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"اسرار، میرے عزیز دوست، بڑی ضروری چیز ہے۔" وہ طنز سے ہنسی "ہم بڑے کمینے لوگ ہیں سب کے سب۔ ہمارے اندر بڑی کمزوری ہے، بڑی بد دیانتی ہے۔ اسے چھپانے کی خاطر، اپنی کشش کو قایم رکھنے کی خاطر ہمیں بہت سے اسرار کی ضرورت پڑتی ہے، سمجھ گئے؟ چلو اُس نوجوان جنگل میں چلیں، یہ بوڑھا جنگل مجھے پریشان کر دیتا ہے۔"

ہم پرانے جنگل سے نکل کر پتلے پتلے نوعمر درختوں والے جنگل میں داخل ہوئے۔ راستوں پر چڑھی ہوئی نوجوان، مردہ پتوں کی تہ پتلی اور سرد تھی۔ آخیر خزاں کی سردی کے اثر سے درخت ننگے ہو چکے

تھے اور دھوپ ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ بلانکا ایک بڑی سی چٹان پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

"ابھی کچھ روز میں برف باری شروع ہو جائے گی۔ پھر یہ سارا سحر ٹوٹ جائے گا۔ پھر یہ ساری جگہیں ایک سی ہو جائیں گی۔ خزاں کا سحر اتنی کم عمر پاتا ہے۔ سارے سحر کم عمر پاتے ہیں۔ تم نے میرا پتہ کیا تھا؟"

"ہاں — پچھلے دو ہفتوں میں تین بار۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔ تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

"ملنا چاہتے تھے؟" اُس نے بے خیالی سے دُہرایا۔

"تم مصروف تھیں۔ تم ہر وقت مصروف رہتی ہو۔"

میرے لہجے کو محسوس کر کے اس نے سہم کر میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھہرو۔ تم کہیں مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے ڈھٹائی سے کہا "میں ایسی حماقت کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ ہنسی "پھر ہم میں دوستی ہو سکتی ہے۔ سب لوگ مجھ سے بغیر پوچھے محبت کرنے لگتے ہیں۔"

"تم کو بڑی خوش فہمی ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"خوش فہمی نہیں سلطان حسین صاحب، سچی بات ہے!" وہ دوبارہ ہنسی" ایکو ایک کر کے لگتا ہے محبت مجھ سے۔ اس لیے کہ میں اُن سب لڑکیوں سے جنھیں وہ جانتے ہیں اور جن سے وہ ملتے ہیں، اس قدر مختلف ہوں۔ یہ اُن کا قصور نہیں اور نہ میرا ہے۔ اور میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔ تم چاہے جتنا بھی اُکساؤ میں کبھی خفا نہ ہوں گی۔ خوش فہمی کا طعنہ دینے کی بجائے اگر تم کہہ دیتے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو بھی ٹھیک تھا۔ میں نے اس سے کہیں بری بری باتیں سنی ہیں۔ اس کے باوجود ساری دنیا سے میری دوستی ہے۔۔ ہے نا؟"

"ہو گی!" میں منہ پھلا کر بیٹھا رہا۔

"دیکھو سلطان، اگر تم مجھے برداشت نہیں کر سکتے تو میں ابھی اُٹھ کر جا سکتی ہوں!"

"ارے نہیں!" میں کھسیانا ہو کر ہنسا "میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا!"

وہ ہنسی اور اپنے مخصوص تیز، تیکھے، ناقابلِ تشریح انداز میں باتیں کرنے لگی۔

اس کے بعد ہم کتنی بار جنگل کی سیر کو گئے۔ کبھی کبھی بائرن اور جین بھی ہمارے ساتھ آ ملتے اور ہم سیر کے بعد شہر جا کر اپنے محبوب ریسٹوران ڈریگن میں آئس کریم کھاتے اور کافی پیتے اور کبھی کبھی جب کسی کے پاس

پیسے جمع ہو جاتے تو حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر کھانا بھی کھا لیتے۔ بائرن نے اب داڑھی رکھ لی تھی اور موسیقی اس کا نیا 'جذبہ' بن چکی تھی۔ پڑھائی سے غفلت برتنے لگا تھا اور جین اس کی ذہنی اور روحانی حالت کی طرف سے بہت فکر مند رہا کرتی تھی۔ ہم اسے ہر وقت تسلی دیتے رہتے تھے وہ اس وقت شدید بیماری، سیدھی سادی لڑکی تھی۔ بعض دفعہ مجھے سچ مچ تاؤ آجاتا اور میرا جی بائرن کو بھرے بازار میں پکڑ کر دو چار رسید کرنے کو چاہتا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی لیکن ہم باقاعدگی سے باہر جاتے رہے۔ ان دنوں میں غیر شعوری طور پر اس کی بات بات میں معنی تلاش کر رہا تھا۔ اس کے ایک ایک اشارے، ایک ایک حرکت اور اس کی ہر دم متغیر طبیعت کے ایک ایک رنگ کو قریب سے دیکھنے اور ان کی مدد سے اس کی شخصیت کے معمے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ میں غیر شعوری طور پر، بہت آہستہ آہستہ اس کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا ہوں۔ اس بات کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔

کرسمس کی چھٹیاں شروع ہونے سے ایک روز کرسمس بال منعقد ہوا۔ میں نے بلانکا سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ پھر ٹال گئی۔

"کس کے ساتھ جا رہی ہو؟" میں نے اصرار کیا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا "مائکل کے ساتھ۔"

"مبارک ہو" میں نے کہا اور چلا آیا۔ شام کو اس کا فون آیا۔

"سلطان تم ناراض ہو؟ مجھے افسوس ہے کہ اس دفعہ بھی میں تمہارے ساتھ ڈانس پر نہیں جا سکتی۔ مائکل اس قدر نازک مزاج لڑکا ہے اگر میں اُس کے ساتھ نہ گئی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں تو تم کو سمجھتی ہوں لیکن سنو، میں نے اپنی ماں سے فون پر بات کی ہے تم کرسمس گزارنے میرے ساتھ چلو ہمارے گھر۔ چلوگے نا! کہیں اور نہیں جا رہے؟"

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارے گھر والے اس پر اعتراض نہیں کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ارے نہیں پاگل آدمی، میری ماں نے خاص طور پر تمہیں مدعو کیا ہے۔ ہم کل شام کی ٹرین سے چلیں گے۔ چلیں گے نا؟"

گو میں اس کے مائکل کے ساتھ جانے پر اندر ہی اندر جلا بیٹھا تھا لیکن میں نے خوشی سے اس کے گھر جانے کی دعوت کو قبول کر لیا۔

شام کو ناچ کے اختتام پر اُس نے کہا "کل شام چھ بجے مجھے ہوسٹل سے لے لینا۔ افیون کھا کر مت سو جانا ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔ باقی باتیں رستے میں بتاؤں گی۔"

"کرسمس مبارک" "کرسمس مبارک" کے شور میں شام کا

ہنگامہ ختم ہوا۔ باہر برف گر رہی تھی۔

اگلی صبح بائرن نے سامان باندھتے ہوئے آکر مجھے بتایا کہ اسے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بلانکا صبح کی گاڑی سے جا چکی ہے۔ میں دو منٹ تک کھڑا دیوار کو گھورتا رہا، پھر فون کی طرف لپکا۔ اس کے ہوسٹل سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔

"کوئی پیغام ؟" میں نے اندھیرے میں ہاتھ چلائے۔

"نہیں سلطان، تمہارے لیے کوئی پیغام نہیں" جین بول رہی تھی، "تم متوقع تھے ؟"

میں نے بدتمیزی سے فون بند کر دیا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بیگ میں بند کی ہوئی چیزوں کو نکال کر کمرے میں پھیلا دیا جائے، میں نے سوچا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

دوپہر کے وقت بائرن نے پھر میرے کمرے میں جھانکا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا "ایں ـــ یعنی یہ کیا حرکت ـ ؟"

"جی ہاں" میں گرجا "ڈریسنگ ٹیبل ننگی تھی چنانچہ میں نے اسے اپنا پاجامہ پہنا دیا ہے اور میرے بوٹوں کے دانت گندے تھے میں نے انھیں ٹوتھ پیسٹ اور برش دے دیا ہے اور ٹیبل لیمپ کو بوٹ پالش

کی ضرورت تھی، میں نے اس پر پالش کر دی اور باقی سب چیزیں بھی اپنی اپنی ٹھیک جگہ پر ہیں۔ آپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، یہ میرا کمرہ ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔" وہ سخت مشکوک نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر میں نے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا اور برف کے اس چھوٹے سے ٹیلے کو، جسے پچھلے تین روز کی برف باری کے دوران میں بڑی احتیاط اور بڑے پیار سے پالتا رہا تھا، ایک زوردار گھونسے کی مدد سے توڑ پھوڑ دیا۔ جمی ہوئی برف کی نازک سوئیاں ہزاروں کی تعداد میں فضا میں بکھر گئیں۔ برف متواتر گر رہی تھی۔ ساری دنیا دودھ کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ وہائٹ کرسمس زندہ باد۔ سرو اور پائن کے درخت برف کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہائٹ کرسمس زندہ باد۔ میری کرسمس گیٹ آؤٹ، نکل جاؤ یہاں سے۔ کرسمس کو باہر نکال کر میں نے کھٹ سے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ برف کے ننھے ننھے، بے آواز، خود سر پھوہے اس پر سر مارتے رہے۔

دوسرے دن مجھے اس کا ایک مختصر سا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کو پورا احساس تھا کہ اس نے سخت بری حرکت کی تھی کہ مجھ کو اطلاع دیئے بغیر بھاگ آئی تھی، لیکن اس کی چند ایک ایسی وجوہات تھیں جو کہ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ مجھے معلوم نہ ہوں

صرف ایک اشارہ ان وجوہات کی طرف اس نے یہ کیا تھا کہ اس کا اپنی ماں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے خط پھاڑ کر پھینک دیا۔

کرسمس بہرحال میں نے اپنے پروفیسر کے ہاں گزاری۔ اس کے بعد کے چند دنوں میں مجھ پر سخت ڈپریشن طاری ہوا۔ انہی دنوں مجھے اس بات کا گمان گزرا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہوں تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

جس روز دوبارہ کلاسیں شروع ہوئیں وہ مجھے لائبریری سے نکلتی ہوئی مل گئی۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے بات نہ کروں گا، لیکن وہ مجھے ایسے ملی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

"ارے سلطان ڈیئر کیسے رہے اتنے دنوں؟ میں تمہیں یاد کرتی رہی سب دوستوں کو یاد کرتی رہی۔ بڑے موٹے تازے، لال سرخ نظر آ رہے ہو۔ برف باری تمہیں راس آ گئی ہے۔ ہے نا؟" اس نے پرانے بے تکلف بے راز لہجے میں کہا۔

"بڑی شدید برف باری ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آج ہم ڈریگن میں کھانا کھائیں گے۔ میں بڑی امیر ہو رہی ہوں آج کل۔ فکر نہ کرو۔ پھر باتیں کریں گے۔ بہت سی۔ میں تمہیں اتنی باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دے میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ میرا سارا غم و غصہ آن واحد میں غائب ہو چکا تھا۔ ڈفل کوٹ اور سرخ رنگ کے اسکارف میں وہ اس قدر دلکش نظر آ رہی تھی۔ میں اسے قریب سے دیکھ کر مسکرا دیا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ جو لڑکے اسے کیمپس بھر میں بدنام کرتے پھرتے تھے پہلی فرصت میں اس کے ارد گرد جمع ہو کر دانت نکالنے لگتے تھے۔

اسی شام ہم ڈریگن کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ صبح کا ہلکا پن غائب ہو چکا تھا اور میری طبیعت کی کدورت پھر اوپر آ گئی تھی۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں ہم دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہ کی تھی۔ اب ہم کافی کا انتظار کر رہے تھے۔

"تمہیں میرا خط ملا تھا؟" آخر اس نے پوچھا۔

"ہاں"

"پھر بھی خفا ہو؟"

"نہیں — تمہارا کرسمس کیسے گزرا؟"

"بڑے مزے میں"

"تمہاری ماں تم سے جھگڑنے کے لیے ہمیشہ کرسمس کے موقعے کو منتخب کرتی ہے؟"

"سلطان!" وہ سانس روک کر بولی "تمہارا خیال ہے میں نے جھوٹ بولا ہے؟"

"اگر جھوٹ بھی بولا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"کمینے ــ" اس نے چیخ کر کہا پھر مجھے آنکھیں جھپکتا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگی "بس؟ اپنا آخری وار بھی کر لیا نا تم نے! تم لوگ بڑی جلدی اپنا سرمایہ ختم کر دیتے ہو۔ غلطی میری تھی، لیکن تم معاف بھی کر سکتے تھے۔"

"بلا لنگا تم ــ"

"انسانوں سے بہت زیادہ وابستگی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

"میری بات سنو!" میں آگے جھک کر چلایا "تم نہیں سمجھتیں۔ تم۔"

"شش ــ" ہونٹوں پر انگلی رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس کے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے پیسے دینے چاہے۔ میں نے بد اخلاقی سے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا کر بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

گرم گرم ریسٹوران میں سے نکل کر یخ بستہ ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں پر آکر لگے اور برف کے پھوہے ہماری پلکوں پر اٹکنے لگے۔ برف کے طوفان میں سر اور منہ لپیٹے ہم دیر تک خاموشی سے سڑکوں اور گلیوں میں چلتے رہے۔ شہر کے اس حصے سے میں ناواقف تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چپکے سے میرے ساتھ چلے آؤ۔" اس نے سرو کے پودے پر سے برف اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

آخر وہ ایک دروازے کے آگے پہنچ کر رک گئی۔ دو بار گھنٹی دینے کے بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ بلا نکا کو دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر فوراً الگ ہو کر میری طرف بڑھی۔

"میرا نام اینا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سب لوگ تہہ خانے میں ہیں۔" وہ مڑ کر بلا نکا سے بولی۔ اس نے تنگ موری کی سیاہ پتلون اور ڈھیلی ڈھالی گہرے رنگ کی سویٹر پہن رکھی تھی اور اس کے بھورے رنگ کے لمبے لمبے سیدھے بال تھے اور اس نے سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے بددلی سے دیکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم تہہ خانے میں اتر گئے۔ یہ بہت چھوٹا سا کمرہ تھا اور سگریٹ اور سگار کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اچھو لگا جب میں سنبھلا تو دو چار بچے اور لڑکیاں ایک ساتھ بلا نکا سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نگاہ ڈالی اور میرا سر چکرانے لگا۔ ایک ہاتھ دیوار پر رکھ کر میں نے دوسری نظر ڈالی۔ کمرے میں دنیا کی ہر شئے جو دستیاب ہو سکتی تھی موجود تھی۔

ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور موسیقی کا ساز وسامان، کتابیں، بیئر کی خالی بوتلیں اور سگریٹوں کے ٹن، میلے کپڑے اور پُرانے جوتے اور پھٹی ہوئی جرابیں اور استعمال شدہ ٹائلٹ کا سامان اور ٹوٹے ہوئے ٹینس ریکٹ اور برتن جن میں دنوں تک بغیر دھوئے ہوئے کھانا کھایا جاتا رہا تھا اور کتنے ہی الم غلم کے انبار چھت تک لگے تھے۔ چھوٹے سے فرش کی ایک ایک انچ جگہ اسی سامان سے اور لوگوں سے بھری تھی اور لوگ — نوجوان لڑکے جن کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور جنھوں نے موٹی موٹی بند گلے کی سوئٹریں اور ڈھیلی ڈھالی پتلونیں اور غیر پالش شدہ جوتے پہن رکھے تھے اور بے انتہا غلیظ دکھائی دے رہے تھے جو موٹی موٹی عینکوں کے نیچے سے اُلوؤں کی طرح دانا، غیر شخصی نگاہوں سے نوواردوں کو دیکھتے تھے اور پھر بڑے بے تکلف، بڑے پیارے انداز میں ہنستے تھے۔ اور لڑکیاں تھیں، جنھوں نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو ہیئر ڈریسر کے ہاتھوں سے ناآشنا تھے اور جو میزوں پر بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہی تھیں۔ ایک کونے میں فرش پر ایک لڑکا بیٹھا 'بانگو ڈرم' بجا رہا تھا اور دوسرا ایک کاغذ پر سے نظم پڑھ کر سنا رہا تھا۔ تیسرا لڑکا خاموش بیٹھا غور سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک چوتھا ان کی طرف پشت کیے رگیں پُھلا پُھلا کر ٹرمپیٹ (بگل) بجانے کی کوشش کر رہا تھا

وسط میں ایک بڑی سی میز پر پانچ چھ لڑکے لڑکیاں بیٹھے کوئی بحث کر رہے تھے اور بئیر پی رہے تھے۔ تیسری دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک لڑکی اکیلی بیٹھی جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی سگریٹ اس کی انگلیوں میں جل رہا تھا۔ دوسرے کونے میں سب کی طرف پیٹھ کئے بائرن بیٹھا پیانو بجا رہا تھا۔ کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بلانکا میز پر بحث کرتے ہوئے لوگوں میں شامل تھی اور ایک لڑکا بار بار اسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سارے منظر نے میرے اندر شدید بددلی کی کیفیت پیدا کر دی۔ دیوار پر سے ہاتھ اٹھا کر میں بائرن کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"بیتھوون۔" وہ سر اٹھا کر بولا "موسیقی کا پیغمبر بیتھوون"۔

"ہوں۔" میں نے دانائی سے سر ہلایا۔

"میں نے 'موون لائٹ سوناٹا' ختم کر لیا۔ یہ پانچویں سمفنی ہے۔ بیتھوون کی موسیقی کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اپنی 'کال' سن لی ہے۔"

"ہوں۔" میں نے دوبارہ سر ہلایا۔

"کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے میاں! کچھ منہ سے بولو۔ تم نے اپنی کال سن لی ہے؟"

"نہیں"، میں بوکھلا کر ہنسا "مجھے تو بلانکا یہاں لے آئی ہے"۔

"جین میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتی"۔ اس نے اداسی سے کہا "تم بھی بلانکا کا یہاں آنا پسند نہیں کرتے ہو گے۔ مگر تم لوگ نہیں سمجھتے تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر رہ جاتے ہو، تم چھوٹے چھوٹے لوگ ہو"۔

مجھے اس کی طرف دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس کی داڑھی غلیظ تھی۔

اسی اثنا میں کئی نوجوانوں نے آکر تعارف کیے بغیر اپنے بے تکلف لہجے میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی اور لوٹ گئے۔ جب دوبارہ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بلانکا اور وہ نوجوان جو اسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا، ٹرمپیٹ اور بانگو ڈرم کی دھن پر ٹیپ ڈانس کر رہے تھے اور باقی سب ان کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تالی کی تال دے رہے تھے بلانکا والہانہ طور پر ہنس رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ اکیلی بیٹھی ہوئی لڑکی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھی۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے رہا تھا۔ میں اور بائرن جا کر تالی بجانے والوں میں شامل ہو گئے۔

جب دو گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو خوش و خرم تھے۔ تازہ ہوا پھیپھڑوں میں داخل کر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گلی ویران پڑی تھی۔ بلانکا نے دیوار کی تاریکی میں دونوں بازو پھیلائے اور بولی "یہ سب میرے دوست ہیں۔ میں ساری دنیا میں شامل ہوں۔ ہم سب ہیں"۔

برف باری رک گئی تھی۔ ہوا رک گئی تھی۔ سردی غائب ہو چکی تھی خوشگوار موسم میں ہم نے اپنے بھاری کوٹوں کے بٹن کھول دیے۔ دکانیں دیر ہوئی بند ہو چکی تھیں۔ شوکیسوں میں روشنیاں جل رہی تھیں ہم ان میں دیکھتے ہوئے چلنے لگے۔

"یہ سفید فر دیکھ رہے ہو؟ وہ کہہ رہی تھی" یہ اصل نایاب منک ہے۔ آج سے دو سال بعد میں کسی لکھ پتی سے شادی کرنے والی ہوں پھر یہ ساری فریں میرے کلوزٹ میں ہوں گی اور میں ناک ہوا میں اٹھا کر تمہارے ایسے لوگوں کے پاس سے شوں کر کے نکل جایا کروں گی۔ تم اگر دو سال کے اندر اندر لکھ پتی بن گئے تو مجھے ضرور اطلاع دینا" وہ ہنسی" یہ سیزان کے سیب ہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چھ ہزار سات سو بیاسی۔ اتنے سیب اس نے پینٹ کیے تھے۔ پتہ نہیں کھائے کتنے ہوں گے؟"

ہر چند قدم پر اس کی اُبلتی ہوئی نوجوان، اداس، دانا، گہری جذباتی، مختصر، ہلکی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ کیمپس تک پہنچتے پہنچتے ہم ہانپ گئے۔ اتنی چڑھائی چڑھنی پڑتی تھی۔ یہاں پر تقریباً حبس ہو رہا تھا۔ ہم نے کوٹ اُتار کر اس کے ہوسٹل کی سیڑھیوں پر رکھے اور ان پر بیٹھ گئے رات میں تازہ گری ہوئی برف کی بو تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس نے کہنا شروع کیا "سلطان میں اکثر جھوٹ بولتی ہوں لیکن اس معاملے میں میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میری ماں کا جغرافیہ کا علم بہت محدود ہے۔ جب میں نے اس سے تمہارے بارے میں کہا تو وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آج تک میں نے کبھی کسی کو اس طرح اپنے گھر مدعو نہیں کیا۔ لیکن شام کو میرے باپ سے اس نے ذکر کیا تو اس نے اسے بتایا کہ پاکستان ایشیا میں ہے۔ اس سے سارا جھگڑا شروع ہوا۔"

"سارا جھگڑا؟"

"ہاں۔ اسے پتہ چل گیا کہ تم ___ یعنی تم ___"

"میں کیا؟"

"کہ تم ___" وہ پھر رک گئی!

"کالا ہوں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

اس نے ایک لمبا سانس چھوڑا "کہ تم ایشین ہو۔ اسی رات کو اس نے پھر مجھے فون کیا۔ میں تمہیں ساتھ لانے پر بضد رہی۔ اس نے کہا کہ اس کو تمہارے رنگ سے یا نسل سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ یہ میرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہے کیونکہ اس سے دوسرے لڑکے ___ میرے ہم عمر لڑکے ___ متعصب ہو جائیں گے اور یہ میرے مستقبل کے لیے بُرا ثابت

ہو سکتا ہے۔ میں نے فون بند کر دیا۔ صبح اٹھ کر میں پہلی گاڑی سے چلی گئی۔ یہ ساری بات تھی۔ تم کو میں اس جھگڑے میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"تو کیا واقعی ـــ" کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا "دوسرے لڑکے ـــ گورے لڑکے؟"

"ہاں" یہ لوگ ظاہر نہیں کرتے مگر بری طرح محسوس کرتے ہیں اور پھر ایک خاموش معاہدے کے تحت اس لڑکی کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا پہلے ہو چکا ہے۔"

"اور تم؟"

"میں؟ ارے پاگل آدمی تم نے سنا نہیں۔ میں تو ساری دنیا میں شامل ہوں!"

"پھر بھی تم ـــ"

اُس نے اپنی بات جاری رکھی "ہم سب ایک دوسرے کی زندگیوں میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی خاطر میں آج تمہارے ساتھ شہر گئی تھی۔ یہاں سے جاتے ہوئے اور شہر میں پھرتے ہوئے ہم دونوں کو بیسیوں لڑکوں نے دیکھا ہے، وہ لڑکے مجھ پر جان دیتے ہیں، وہی جو مجھے بدنام کرتے رہتے ہیں۔ جو میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں کس کی پرواہ کرتی ہوں۔ میں آزادی چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہے گا تو دن دہاڑے جا کر کسی سیاہ فام

آدمی سے شادی کر لوں گی۔ یہ لوگ مجھے بدنام ہی کریں گے نا۔ میں اس کی عادی ہوں۔ پھر یہ لوگ بھول جائیں گے، لوگ بھول جاتے ہیں۔ اسی خاطر میں آج تمہیں ان لوگوں کے درمیان لے گئی تھی جو سوسائٹی سے نکالے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی نے جن کو ملعون قرار دیا ہے جن کی مذمت میں اخباروں کے ورق کے ورق سیاہ کیے گئے ہیں۔ جو غلیظ ہیں اور آوارہ ہیں اور غیر منظم زندگیاں بسر کرتے ہیں اور لامذہب ہیں لیکن پاگل آدمی۔" وہ آہستہ سے ہنسی "تم نے دیکھا ہے؟ یہی لوگ ہیں جو زندگی کو اس کی اصل بنیادی شکل میں دیکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، جنھوں نے اپنے اوپر سے تہذیب کے ہر خول کو اتار پھینکا ہے تاکہ زندگی کو ننگا کر سکیں، جنھوں نے اپنی سمت خود متعین کرنے کی خاطر پرانی سمتوں کا احساس ہی کھو دیا ہے۔ جو زندگی کی نیکی اور محبت اور سادگی میں یقین رکھتے ہیں لیکن مذہب نے جنھیں بددل کر دیا ہے، کیونکہ بیسویں صدی میں دنیا کے اس سب سے تہذیب یافتہ ملک میں ایک چرچ سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے چرچ سے تعلق رکھنے والے کی دکان سے ضرورت کی کوئی چیز بھی نہیں خرید سکتا، کیونکہ ایک مذہب دوسرے مذہب سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ یہ لوگ کسی قوم یا مذہب یا نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہ محض انسان ہیں جن کے پاس ان کا دماغ

ہے جو انھیں کسی پل چین لینے نہیں دیتا، جو انھیں دکھ دیتا رہتا ہے۔ یہ گندے ہیں لیکن اپنی تمام تر غلاظت اور بے ترتیبی اور کنفیوژن میں سے خوبصورتی اور محبت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ خوبصورتی کا تصور پیدا ہونا یا نہ ہونا محض اتفاق کی بات ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کون اس کی تلاش میں نکلتا ہے، کون اتنی جرأت کرتا ہے ــــ یہ لوگ آزاد ہیں اور آزادی چاہتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں۔ میں کوئی بندش قبول نہیں کر سکتی۔ میں کسی سے دل چسپی نہیں رکھتی، کسی کی پرواہ نہیں کرتی، صرف آزادی چاہتی ہوں، آزادی ــــ" وہ پرندے کی طرح بازو ہوا میں پھیلا کر کھڑی ہو گئی "آزادی میری خواہش ہے"

پھر وہ اچانک بیٹھ گئی "سلطان سنو۔ میرا کمرہ دیکھنا چاہتے ہو چلو تمہیں دکھاؤں ــــ چلو ــــ" وہ بولی۔

"مگر ــــ کیسے؟"

"اس وقت سب سو رہے ہیں۔ میرے پاس باہر کے دروازے کی چابی ہے۔ ہم چپکے سے اوپر چڑھ جائیں گے۔ تم یہیں بیٹھو، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ جب اشارہ کروں تو آ جانا"

مجھ سے مزید اجازت لیے بغیر وہ چپکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں مبہوت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے

دروازے میں آکر اشارہ کیا تو میں بے خودی میں اپنا کوٹ وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ اندر گرم پانی کے پائپوں کی ہلکی ہلکی حرارت تھی۔ ہم چوروں کی طرح دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ وہیں پر دوہری ہو گئی۔ چند منٹ تک اس کا سارا جسم خاموش ہنسی کے اثر سے ہلتا رہا۔ اس وقت وہ مجھے ایک ننھی سی چمکیلی آنکھوں والی بچی کی طرح لگی جو سب بڑوں کے سو جانے کے بعد اپنے ہم عمر بچے کے ساتھ کیک چرانے کا پروگرام بنا رہی ہو۔

"اس وقت اگر کسی کو تمہاری موجودگی کا علم ہو جائے تو ہم دونوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔" وہ بولی "مجھے ان باتوں میں بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے، بڑے ایڈونچر کا۔ تم دوسرے شخص ہو جو میرے کمرے میں آئے ہو۔ پہلے میرو آیا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں کمرے کے وسط میں کھڑا رہا۔ اس کا کمرہ ہر لڑکی کے کمرے کی طرح تھا، مگر سخت بے ترتیب! صرف دیواروں پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے، سیاہ رنگ کے، بدہئیت، پرانی دیمک زدہ لکڑی کے ٹکڑے دھاگوں کے ساتھ کیلوں سے ٹنگے ہوئے تھے۔

"یہ ڈرفٹ ووڈ ہے۔ میں ڈرفٹ ووڈ جمع کرتی ہوں۔ تم بھی

کرتے ہو؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔"

"یہ تم لے لو۔" اس نے ایک لکڑی دیوار سے اتار کر میری طرف بڑھائی "لے لو، یہ میری سب سے قیمتی لکڑی ہے۔ یہ میں نے پار سال اطلانتک میں سے پکڑی تھی۔ اور یہ" اس نے دوسری لکڑی اتار دی "میری سب سے خوبصورت لکڑی ہے۔ یہ بھی تم لے لو۔"

پھر وہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی "تب مجھے چومو۔" اس کی آنکھوں سے تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ میں نے جھک کر آہستہ سے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو چوما۔ پھر میرے دماغ میں آگ لگ گئی۔ دونوں لکڑیوں کو فرش پر پھینک کر میں نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

"بلا نکا!" میں چیخا "میں بچہ نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے کھلونے نہیں چاہئیں۔ میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں۔ مجھے تم سے ۔۔۔ تم سے عشق ہے ۔۔۔ تم ۔۔۔"

میری بلند ہوتی ہوئی آواز کو سن کر وہ چند لمحے کے لئے سکتے میں آ گئی۔ پھر تیزی سے لپک کر اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول کر مجھے باہر دھکیل دیا۔

Scanned by CamScanner

بند دروازے کے پیچھے مجھے اس کی تیز تیز سانس لینے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔

پنجوں کے بل بھاگتا ہوا میں سیڑھیاں اترا اور باہر نکل آیا۔ برف گرنی پھر شروع ہو گئی تھی۔ خاموش سفید رات میں میں اپنے کوٹ کے پاس سن کھڑا دل کے دھڑکنے کی آواز سنتا رہا۔

برف باری شدید ہو گئی۔ در و دیوار، شجر اشجار اور حد نظر تک زمین و آسمان دودھیا سفید رنگ میں رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے میں دن بھر لیبارٹری میں اور رات گئے تک اپنے کمرے میں کافی پیتا اور کام کرتا رہتا تھا۔ میرا وظیفہ صرف ایک ٹرم کا تھا اور انہی چند مہینوں میں مجھے اپنا تھیسس مکمل کرنا تھا۔ لائبریری سے لائی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر میری میزوں پر، کرسیوں پر، اور صندوقوں پر پڑے رہتے تھے۔ اس سرد، بے رنگ اور بے بو دنیا میں یوں لگتا تھا کہ پڑھنا اور کام کرنا انسان کی آخری جائے پناہ رہ گئی ہے اور پھر دفعتاً ایسا ہوا کہ اس سرد، بے رنگ دنیا میں بلانکا کے لئے میرا جذبہ کافور ہونے لگا۔ کبھی کبھی لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر میں اسے صاف طور پر محسوس کرتا، دل ہی دل میں اس پر متعجب،

ہوتا، پھر اطمینان اور پشیمانی کا گہرا سانس لیتا اور خوردبین پر جھک جاتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر میں پھر جذباتی طور پر مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

اب بھی ہم اکثر ملتے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اب بھی میں، بائرن، جین اور بلانکا 'ڈریگن' میں اپنی مخصوص میز کے گرد جمع ہوتے یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں غل مچاتے اور اکٹھے 'سکی انگ' کے لیے جاتے، مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جلتے ہوئے جذبے کی ساری بے چینی اور سارا درد اب گزر چکا تھا اور اس کی جگہ ہلکی سی پشیمانی اور گہرا اطمینان اور دائمی رفاقت کا احساس رہ گیا تھا۔ اب ہم برابر کی سطح پر آ گئے تھے اور اس پر خوش تھے۔ اس رات والے واقعے کا ذکر کسی نے کبھی نہ کیا۔ بائرن پر برابر دیوانگی کا وہ دور گزر چکا تھا اور اس نے داڑھی بھی صاف کروا دی تھی لیکن موسیقی میں اس کی دلچسپی بڑا سنجیدہ اور بالغ جذبہ بن چکی تھی۔ وہ گہرے شعور کے ساتھ اب اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جین کے ساتھ اب اس کی مکمل صلح تھی۔ بلانکا اسی طرح حسین، متلون مزاج اور بڑی عزیز دوست تھی۔

اس کے باوجود اس کی دل کشی اور اس کے تلون اور اس کی ساری شخصیت کے معمے کے بارے میں ایک گہرا استعجاب، گہرا تجسس

میرے دل میں راہ پا گیا تھا جس کی ہلکی ہلکی آنچ ہر وقت اندر سلگتی رہتی تھی اور کبھی مجھے پورے طور پر اس سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی گو اس کے بعد میں نے شعوری طور پر اس سلسلے میں کبھی کوئی کوشش نہ کی۔

لیکن پھر بہار کا موسم آیا اور برف ساری پگھل گئی اور نئی کونپلیں کے رنگ فضا میں بکھر گئے۔ سالانہ "پرام" ڈانس سے تین ہفتے قبل مجھ پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا اور مجھے کیمپس ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا ایک روز بلانکا مجھے دیکھنے آئی تو اس کے ہاتھوں میں سفید پھولوں کے گلدستے تھے "یہ بہار کے پہلے پھول ہیں"۔ اس نے کہا "تمہارے لئے اُگے ہیں۔ انہیں چومو"۔ میں نے ہنس کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھولوں کو تکیے کے برابر رکھ دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر روزانہ کے قصے سنانے لگی۔ میں نے پانچ روز سے شیو نہیں کیا تھا اور خاصا کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے میں بیچ بیچ میں آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک بار میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ خاموش بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سلطان کب واپس جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آج سے پورے ایک ماہ بعد"

"تمہارا تھیسس مکمل ہو گیا؟"

"تقریباً۔"

"سلطان!" وہ آگے جھک کر بیٹھ گئی "میں 'پرام' ڈانس پر تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"اگر تم چاہتی ہو تو۔" میں نے کہا۔

"میری ایک بات مانو۔"

"کہو۔"

"تم داڑھی رکھ لو۔"

میں ہنسنے لگا۔

"ہنسو نہیں پاگل آدمی۔ میری بات سنو۔ بس اسے بڑھنے دو چند روز تک، پھر اسے ترشوا لینا۔ وہ جیسے بائرن نے ترشوائی تھی پھر۔ پھر میں تمہارے ساتھ جاؤں گی اور اس روز میں بھی تمہیں ایک سرپرائز دوں گی۔"

Surprise

"تم بھی داڑھی رکھو گی۔"

"کچھ نہ کچھ بہرحال ہو گا۔ تمہیں بڑی اچھی لگے گی، یقین کرو۔ رکھو گے نا؟ مان لو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا "میری خاطر۔ کہو ہاں۔"

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کچھ اس کی خاطر، کچھ پرانے وقتوں کی خاطر 'ہاں' کر دی۔

بیماری سے اٹھتے اٹھتے مجھے دو ہفتے لگ گئے۔ دسویں روز جب وہ مجھے دیکھنے کو آئی تو سفید پھولوں کا گلدستہ بستر پر رکھ کر اس نے جیب سے قینچی نکالی اور انہماک کے ساتھ میری داڑھی تراشنے لگی میں اس کی مشاقیِ فن پر حیران رہ گیا۔

ڈانس سے ایک روز پہلے وہ مجھے شہر لے گئی۔ 'ڈریگن' میں آئس کریم کھانے اور کافی پینے کے بعد ہم واپس ہوئے۔ راستے میں وہ ہیئر ڈریسر کی دوکان کے سامنے رک گئی۔

"دیکھو یہ ہمارا ہیئر ڈریسر جان ہے۔ اس سے سب طے ہو چکا ہے۔ یہ تمہاری ڈاڑھی کو خوب صورتی سے تراش دے گا اور اسے سنہرا رنگ دے دے گا۔" اس نے کہا "اب دیکھو ضد مت کرنا، ورنہ میں یہیں پر بیٹھ کر رونے لگوں گی۔"

جان کے شیشے میں دیکھتے دیکھتے میری شکل تبدیل ہو گئی۔

"اب تم بالکل جارج پنجم لگتے ہو۔" وہ میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔" میں نے سنجیدہ جواب دیا اور پیسے دیکر باہر نکل آیا۔

جب بلانکا باہر نکلی تو مجھے دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑی۔ لیکن میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس کے سر پر سفید چمکدار جھلملاتی ہوئی چاندی کے تار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بال چھوٹی عمر کے جپسی لڑکوں کی طرح کٹوائے تھے اور 'سلور گرے' میں رنگائے ہوئے تھے اپنی جسامت سے کم عمر لڑکا، بالوں کے رنگ سے بڑھیا اور اپنے حسین چہرے سے نوجوان عورت دکھائی دیتی تھی۔ سب کچھ ملا کر دیکھنے پر انسان چکرا جاتا تھا۔ میری بوکھلاہٹ کو دیکھ کر اس نے مضبوطی سے اسکارف سر پر باندھ لیا۔

ناچ کی شام کو ہم دونوں کے گرد میلہ رہا۔ اس کو ان گنت لڑکوں اور مجھے ان گنت لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنا پڑا۔ شام جب اپنے عروج پر تھی تو میں اور وہ اچانک آمنے سامنے آ گئے۔ ناچ کی گرمی اور شباب اور ایک دوسرے کی ہئیت کے مضحکے کے باوجود ہم نے اس وقت کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کی کہ ہم سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے بجائے ہم نے ایک ساتھ نظریں نیچے گرا دیں اور، یوں جیسے پہلے سے کیے گئے فیصلے پر عمل کر رہے ہوں، باہر نکل آئے۔ برآمدے کی بتیاں قصداً بجھا دی گئی تھیں۔ نیم تاریکی میں آہنی ریلنگ جھلملا رہی تھی۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آٹھ ہزار میل۔"

وہ ریلنگ پر جھکی رہی۔ ہال میں بتیاں ایک ایک کر کے بجھائی جانے لگیں، حتیٰ کہ صرف چھت کا وسطی فانوس جلتا رہ گیا۔ نیچے وی آنا کا والز ہو رہا تھا: بلیو ڈینیوب، کی مانوس، آہستہ آہستہ اٹھنے والی، قریب آنے والی، دور جانے والی، روح میں داخل ہونے والی، پگھلا دینے والی کیف آگیں موسیقی ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔

"سلطان!" اس نے کہا "ہم زندگی میں ہزاروں میل طے کریں گے، لیکن یہ آٹھ ہزار میل شاید کبھی طے نہ کر پائیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد ہم شہر کے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ ڈریگن امیں چند منٹ بیٹھنے کے بعد وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے کئی ایک جگہیں بیٹھنے کے لئے تجویز کیں لیکن وہ چلتی گئی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ جیسے بیٹھنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو تھکا کر چور کر دینا چاہتی ہو۔ مگر پھر وہ ایک ادھ کھلے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی۔

یہ آئس ہاکی' کا اسٹیڈیم تھا جہاں پر دو، روز پہلے ایک مشہور میچ ہو چکا تھا، جس میں یونی ورسٹی کے تماشائی لڑکوں نے بڑی دھاندلی کی تھی اور قصہ ڈین جنکنز تک پہنچا تھا۔ ہم نیم تاریک گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہمارے چاروں طرف پچیس ہزار نشستیں خالی پڑی تھیں اور اس عظیم اسٹیڈیم میں اس وقت صرف ایک وسطی لائٹ جل رہی تھی جو نیچے برف کی چمکتی ہوئی سفید سطح پر روشنی کا چھوٹا سا گول دائرہ بناتی تھی۔ چند مزدور پھاوڑوں کی مدد سے فالتو برف کو سمیٹ رہے تھے اور اگلے کھیل کے لئے برف کا میدان ہموار کر رہے تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر ہمیں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور کام میں مصروف رہے۔ ہم ان گنت سیڑھیاں چڑھنے کے بعد سب سے پچھلی تاریک رو میں جا کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف سے خالی اسٹیڈیم کی بیکراں وسعت عود کر آ رہی تھی اور بیچ میں ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے ہم دونوں کی چھوٹی چھوٹی، دھندلی، اکلوتی شکلیں بے ٹھکانا فقیروں کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس جگہ جہاں پر ہم نے ہمیشہ روشنیوں کا اور انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا، اُچھلتا کودتا، ناچتا اور شور کرتا ہوا پر رونق سمندر دیکھا تھا، اب ہم خاموش اور اکیلے بیٹھے تھے اور ایک عظیم اور خوفناک احساسِ تنہائی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا

تھا۔ دور نیچے تین بڈھے بدحال مزدور پھاوڑوں سے برف کی سطح ہموار کرتے ہوئے روشنی کے دائرے میں داخل ہو رہے ہے، روشنی کے دائرے سے نکل رہے تھے اور بیچ بیچ میں بھاری، اداس آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔

آخر بابا نے، جو نیچے روشنی کے گیلے، چمکدار دائرے میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، خفیف جھرجھری لی اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

"میرو نے یہاں ہاکی کھیلنا سیکھا تھا" اس نے کہا۔

"میرو کو تم بہت یاد کرتی ہو!" میرا لہجہ حسد کے کسی جذبے سے حیرت انگیز طور پر پاک تھا۔

"اس سے میرا بھائی چارہ تھا۔"

"یہ تمہارا میرے کچھ پلے نہیں پڑا۔" میں نے کہا "مجھ سے بھی ہے اور بائرن سے بھی ہے اور ساری دنیا سے ہے۔"

"تم غلط سمجھے ہو۔" وہ بولی "اور کسی سے نہیں تھا صرف اس سے تھا۔"

"کوئی بڑا خاص آدمی ہوگا یہ مسٹر میرو؟"

وہ روشنی کے دائرے میں دیکھتی رہی "میرو ہسپانوی خانہ جنگی کی اولاد تھا۔ اس کے ماں باپ فرانکو کی فوجوں کے خلاف لڑتے ہوئے سول وار کے دوران ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ان دنوں

وہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ تم کہو گے: محبت کرنے کی کسے فرصت تھی؟ لیکن محبت کرنے کے لئے کسے فرصت کی ضرورت ہوتی ہے؟ میرو ایک پہاڑی غار میں پیدا ہوا۔ اس کے چند ماہ بعد وہ دونوں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ میرو کو ایک بوڑھے سپاہی نے پالا۔ جب میرو پندرہ برس کا ہوا تو بوڑھا سپاہی بھی مر گیا لیکن مرنے سے پہلے وہ میرو کو سب کچھ بتا گیا۔ میرو بڑی اٹل شخصیت کا مالک تھا۔ "میں اپنے ماضی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا" اس نے مجھے بتایا" اور نہ میری خواہش ہے۔ میں بہت بڑا جرنلسٹ بنوں گا"۔ اُن دنوں میں اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ میری زندگی میں پہلا اور آخری مرد تھا میں اس سے بہت خوف زدہ رہتی تھی، کیونکہ وہ مجھے تباہ کر دینے پر قادر تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا: زندگی میں اگر خوش رہنا ہے تو دنیا سے بھائی چارہ کرو پاگل لڑکی، باقی سب بیکار ہے۔ سب بھول جاؤ۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ اپنی دیوانگی پر قابو پانے لگی۔ لیکن میرے پاس اس کا ذہن نہ تھا۔ وہ اپنے حادثے کو بھول گیا تھا۔ میں اپنے حادثے کو نہیں بھول سکی۔

"میرو کو؟" میں نے پوچھا۔

وہ اداسی سے ہنسی" میرو کو کون یاد کرتا ہے وہ تو محض ایک سمبل تھا۔"

"سمبل؟"

"ہاں"۔ اس نے مختصراً کہا۔

دفعتاً میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

یکساں، اداس آواز میں اس نے اپنی بات جاری رکھی: "تین سال میں اُن کے ہاں تین لڑکے ہوئے۔ پھر میری ماں بیمار پڑ گئی۔ اور ڈاکٹر نے بتایا کہ مزید بچے کی پیدائش ناممکن ہے۔ وہ گھرانا ایک بیٹی بھی چاہتے تھے۔ وہ خوش حال لوگ تھے۔ چنانچہ وہ 'ہوم' (لاوارث بچوں کی رہائش گاہ کو عموماً محض 'ہوم' کہہ کر پکارا جاتا ہے) پہنچے اور سب سے پیاری بچی کو منتخب کر کے گھر لے آئے میں سیکنڈری اسکول میں تھی جب مجھے یہ سب کچھ بتایا گیا۔ اس وقت میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی بچی کی حیثیت سے گھر بھر میں ممتاز تھی اور بھائیوں نے میری عادت کافی حد تک بگاڑ رکھی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ پیسے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے اور میرے ساتھ سب سے زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا تھا۔ پھر ایک روز جب میرے بھائی باہر گئے ہوئے تھے میرے باپ نے مجھے پاس بلایا۔ میری ماں بھی قریب بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ

لاڈ تھا۔ میرے باپ نے کہا: "اب تم سمجھ دار ہو گئی ہو اور ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے!" اس نے مجھے بتایا اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ لیکن ایک بات وہ چھپا گیا۔ اُس نے کہا کہ میرے اصل ماں باپ دو غریب انگریز میاں بیوی تھے جو کچھ روز پہلے انگلستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اور میری پیدائش کے فوراً بعد ٹریفک کے ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ میں اداس ہو گئی۔ مجھے افسردہ دیکھ کر اس نے کہا: دنیا میں سب بچوں کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہوتی ہے، لیکن تم وہ خاص الخاص آدمی ہو جسے منتخب کیا گیا ہے سینکڑوں بچوں میں سے، تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ میں خوش ہو گئی۔ ان کا فرض پورا ہو گیا۔ وہ اس بات کو بھول گئے مگر میں نہ بھول سکی۔ یہ نہیں کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ اس دن سے لے کر آج تک میں ایک درجن ماہران نفسیات کے پاس جا چکی ہوں۔ آخر مجھے پتہ چلا ہے کہ ماہرانِ نفسیات اگر احمق نہیں تو خوش فہم ضرور ہوتے ہیں۔ اس روز ان دونوں میاں بیوی نے، جو میرے ماں باپ ہیں، میرے دل میں ایک خوف بٹھا دیا تھا جسے آج تک کوئی نہیں نکال سکا۔ وہ مجھ پر اسی طرح مہربان رہے جس طرح ہمیشہ سے تھے اور میرے بھائی اسی طرح مجھے لاڈ پیار سے

بگاڑتے رہے اور میں اسی طرح کنبے کا خاص الخاص فرد بنی رہی لیکن اس روز کے بعد میں نے ایک بار بھی یقین کے ساتھ کبھی نہ سوچا کہ میں وہی لڑکی ہوں جو سولہ سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہتی آئی ہوں۔ میرے ماں باپ نے کبھی میری داخلی زندگی کو جاننے کی کوشش نہ کی۔ انھیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میرے ماں باپ کے روزآنہ کام کے اوقات بڑھتے گئے، آٹھ سے دس اور دس سے بارہ گھنٹے ہوئے، اس لئے کہ ہم خوش حال سے خوش حال تر ہوسکیں، اس لئے کہ ہمارے ہمسایوں کے پاس بڑھیا فرنیچر تھا اور ہم ان سے بازی لے جانے پر مُصر تھے، صرف اس بنا پر کہ ہم ان کے بازو میں رہتے تھے۔ مذہب ہمسائے کے ساتھ محبت کرنا سکھاتا ہے نا؟ ہم ان سے محبت کرنے میں مصروف تھے کہ اس ملک میں یہی طریقہ محبت کرنے کا رائج ہے۔ پھر انھوں نے بڑی عمدہ کار خریدی اور میرے باپ کی زندگی کا اولین مقصد ان کی ایسی کار خریدنا بن گیا۔ میرا باپ بڑا کامیاب شخص ہے۔ ایک دن وہ آیا جب ہمارے پاس سب کچھ تھا جو ہمارے ہمسائے کے پاس تھا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ پھر میرے باپ نے مکان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ اب ہم اپنے تمام ہمسایوں میں سب سے زیادہ

خوش حال تھے اور یہ لوگ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ہم ان میں
رہتے چلے جائیں۔ ہم نئے مکان میں آ گئے جو بڑے فیشن ایبل
علاقے میں تھا۔ میرے باپ نے آرام دہ مکان میں ذرا دیر رک کر
سستانے کی بجائے اپنے کام کے اوقات مزید بڑھا دیئے۔ اب
وہ آدھی رات تک گھر پر کام کرتا رہتا تھا، اس لئے کہ اپنے
نئے ہمسایوں میں ہم سب سے زیادہ بدحال تھے اور ان سے ٹکر
لینے پر مصر تھے، محض اس بنا پر کہ ہم ان کے بازو میں رہتے تھے
میں تمہیں الف لیلی کی کہانی نہیں سنا رہی، یہ ہمارے ملک کا دستور
ہے۔ یہاں فرد تباہ ہو جاتا ہے اور سوسائٹی مضبوط تر ہوتی جاتی
ہے۔ سال کے آخر پر اعداد و شمار شائع ہوتے ہیں اور ہمیں پتہ
چلتا ہے کہ آج ہم دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک میں رہ رہے
ہیں اور فی کس دنیا میں سب سے زیادہ کما رہے ہیں اور اپنے
جسموں کو دنیا کی عمدہ ترین غذا پر پال رہے ہیں اور بھاگ رہے
ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور پتہ نہیں کہ کدھر
جا رہے ہیں۔ ہماری روحوں کو دن بھر میں کتنی کیلوریز کی ضرورت
ہے، اس کے اعداد و شمار ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

معاف کرنا، میں بھٹک گئی تھی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ

میرے ماں باپ کو ذرا فرصت نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے گھر کو نعمتوں سے مالامال کر رکھا تھا اور اپنے بچوں کو دنیا کے خوش قسمت بچوں میں تصور کرتے تھے اور وہ شاید غلطی پر بھی نہ تھے لیکن میں اب بدل چکی تھی۔ جہاں میں پہلے ہر وقت ناک چڑھائے رہتی تھی وہاں میں اب اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو گہری احسان مندی اور خوف سے دیکھنے لگی تھی جیسے کہ میں اس گھر میں چور دروازے سے داخل ہو کر غاصبانہ قبضہ جما بیٹھی تھی اور یہ لوگ مجبور ہو گئے تھے اور مجھے مستقل برداشت کئے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے وہ مجھے بہلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے وہاں اب میں نے ہر چھوٹی موٹی بات میں انھیں خوش کرنے کے راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے۔ میں موقع بے موقع مسخرے پن کی حرکتیں کرتی اور وہ قہقہے لگاتے اور میں دل میں مطمئن ہو جاتی، آزردہ ہو جاتی پریشان ہو جاتی۔ میں یک لخت جوان ہو گئی تھی۔ اپنی نئی زندگی میں عظیم داخلی پریشان حالی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید بوڑھی ہو گئی تھی مجھے اپنے اوپر تک بالکل غیر فطری شخصیت کا خول چڑھانا پڑا۔ اپنی شرمندگی کو، اپنی خفت کو، اپنے احساس جرم کو چھپانے کے لئے! کسی کو فرصت نہ تھی یہ جاننے کی کہ مجھ میں یہ تبدیلی کیوں کر آئی۔

سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ سب کا فرض پورا ہو چکا تھا صرف میرا فرض باقی رہتا تھا۔

پھر ایک روز رابرٹ کو میں نے اپنا ہمراز بنا لیا۔ وہ سیکنڈری کے آخری سال میں میرا ہم جماعت اور گہرا دوست تھا۔ ایک دن میں اور وہ جھوٹ موٹ کے میاں اور بیوی بن کر 'ہوم' جا پہنچے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم کوئی بچہ گود لینا چاہتے ہیں اور درخواست دینے سے پہلے انکوائری کے لئے آئے ہیں۔ ہم وہاں بے مقصد گھومتے اور ان کی فائلیں دیکھتے رہے پھر میں نے وہاں کی سب سے بوڑھی میٹرن کو ایک طرف لے جا کر اپنے بچپن کی تصویر دکھائی اور پوچھا کہ کیا وہ اس بچی کو جانتی ہے؟ اس نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا اور میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بولی 'تم اس لڑکی کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو؟' میں نے اس سے کہا کہ یہ لڑکی میری بچپن کی ساتھی تھی اور ایک سال کا عرصہ ہوا کہ مر چکی ہے۔ یہ سن کر وہ بدحواس ہو گئی اور کہنے لگی کہ قانونی طور پر 'ہوم' کو اس کی اطلاع ہونا چاہیئے تھی جو کہ نہیں کی گئی۔ وہ اپنی فائلوں کی طرف دوڑی لیکن جاتے جاتے اپنی بدحواسی میں مجھے بتا گئی کہ یہ لڑکی سترہ سال ہوئے اس کے سامنے ہی لائی گئی تھی اور کہ جاڑوں کی اس صبح کو یہ لڑکی شہر سے باہر باغ کے ایک بنچ پر ٹھٹھری ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کی ماں کے بارے میں

کسی کو علم نہ تھا۔ باپ قانونی طور پر شاید کوئی تھا ہی نہیں۔

اسی شام میٹرن ہمارے گھر آئی اور میرا پول کھل گیا۔ مجھے کھلے بندوں مجرم قرار دیا گیا اور ایک ہفتے تک، میرا باہر نکلنا اور گھر والوں سے میری بول چال بند کر دی گئی۔ لیکن اب مجھے پرواہ نہ تھی۔ میرے دل میں نفرت اور جرم کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ایسی آگ جو گھن کی طرح اندر ہی اندر ہی کھائے بھی جاتی ہے اور زندہ رہنے کا اور جی بھر کر نفرت کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتی ہے۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان ایک جھوٹ جنم لے چکا تھا جس کے بل پر ہم رہ رہے تھے۔ وہ جھوٹ جو دوست اور دوست بھائی اور بہن، میاں اور بیوی، ماں اور بچے کے مابین پیدا ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کو، دو ساتھ رہتے سہتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے ہوئے انسانوں کو ایک دوسرے کے رو برو کھڑے ہو کر نفرت کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ان کی ہر مہربانی، ہر نیک دلی اور ہر وارفتگی اب مجھے اپنے اوپر ان کا احسان عظیم دکھائی دیتا تھا کہ جیسے میں ان کی سترہ سال کی جمع شدہ لطف و عنایات کی مقروض ہوں۔ اس خیال نے کہ دنیا میں کوئی میری پیدائش کا خواہش مند نہ تھا کہ خدا نے اپنے عکس میں مجھے تخلیق کیا اور اس پر شرمندہ ہوا کہ میرا وجود ایک جرم تھا جو سڑک کے کنارے سرزد ہوا اور پکڑا گیا اور نشر ہوا لیکن کسی کے سر نہ چڑھا اور ساری دنیا کی ذمہ داری بن

گیا کہ جو بعد میں ترس کھا کر پناہ میں لے لیا گیا اور اس خاطر داری سے پالا گیا جس سے سیامی بلی یا فوکس ٹیریر کتے کے بچے کو پالا جاتا ہے، کہ جسے بڑا ہونے پر احساس دلایا گیا کہ یہ جو اس کے سر پر سایہ اور ایک کنبے کی رفاقت اور نگرانی اور کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا اور ماں باپ کی محبت اور دوسری اتنی ساری چیزیں اسے مہیا کی گئی تھیں ان پر اس کا کوئی پیدائشی حق نہیں تھا بلکہ یہ عنایات تھیں جو اس پر کی گئی تھیں اور بدلے میں اس سے ہر ہر شئے کے لئے شکر گزاری کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس خیال نے میری ساری شخصیت کو مسخ کر دیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس میں کسی کا بھی قصور نہ تھا۔

پھر میں یونیورسٹی میں آگئی۔ اب تک وہ میری کل تعلیم پر دس ہزار ڈالر خرچ کر چکے ہیں، ایک اور خیال جو کہ ہر دم میرے پیچھے لگا رہتا ہے یہ ہے کہ ایک روز میں ان کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گی۔ پھر میں آزاد ہو جاؤں گی۔ پچھلی گرمی کی چھٹیوں میں میں نے تین ماہ تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ویٹرس کا کام کیا تھا۔ کھانا کھانے کے لئے آتے ہوئے ٹرک ڈرائیور اور گندے گندے فیکٹری ورکر میری کمر میں انگلیاں چبھویا کرتے تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی طاقت ور ہے۔ ایک بار میں نے خواب میں

دیکھا تھا کہ جیسے میرے کندھوں پر پر ہیں اور میں اڑ رہی ہوں اور اُڑتی جا رہی ہوں اور پھر بادل آ گئے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں اوپر اُٹھ رہی ہوں اور نیچے اتر رہی ہوں اور ابھی غائب ہو جاتی ہوں، ابھی باہر نکل آتی ہوں۔ پھر بادلوں پر ایک جگہ رک کر میں نے دم لیا اور دوبارہ اسی آسانی اور تیزی کے ساتھ اُڑنے لگی۔ اب نیچے سفید بادلوں کا فرش تھا اور اوپر نیلا آسمان تھا اور چاروں طرف بیکراں وسعت تھی اور سناٹا تھا اور امن تھا اور آزادی تھی اور میں کوشش کئے بغیر جس طرف چاہتی تھی مڑ جاتی تھی کبھی تیز کبھی ہولے، کبھی اوپر کبھی نیچے، میری بے آواز، بے حرکت اڑان تھی اور آزادی اور وسعت ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ میں فرطِ مسرت سے کھل اٹھی "یہ آسمان میرا ہے"۔ پھر اسی مسرت کے مارے میں رونے لگی اور میری آنکھ کھل گئی۔ آج اس بات کو کئی برس گزر چکے ہیں اور میں اس خواب کے لئے ترس گئی ہوں۔ ہر روز رات کو جب میں خواب آور دوائی کھاتی ہوں تو اس کے لئے دعا مانگتی ہوں لیکن یہ خواب پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گھر میں میری دو شخصیتیں ہو گئی تھیں، یہاں پہنچنے پر تین ہو گئیں، چار ہو گئیں، پتہ نہیں کتنی ہو گئیں۔ ہر مرد سے مجھے خوف آنے لگا اب تک آتا ہے۔ ہر مرد کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے "یہ مرد — میرے قریب آ گیا تو مجھے تباہ کر دے گا"۔ دنیا کے ہر مرد کی جانب سے میرے

دل میں بدظنی پھیل گئی ہے۔ حالانکہ تمہیں سن کر تعجب ہوگا کہ آج تک کسی مرد نے مجھے ذرا سا بھی دکھ نہیں دیا۔ ہر مرد کی کشش سے بچنے کے لئے میں نے اپنے اوپر کتنے ہی خول چڑھائے ہیں۔ میں نے باتیں کرنے کا اور باتیں کرتے جانے کا فن سیکھا ہے۔ میں دنیا کے ہر موضوع پر نہایت دل چسپ اور معلومات افزا گفتگو کر سکتی ہوں، حالانکہ مجھے کسی ایک موضوع کے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ میں دنیا کی عظیم کتابوں اور عظیم موسیقی اور انگلستان کی سیاسیات اور کیمپس کے سارے اسکینڈلز کے متعلق ایک ہی سانس میں، ایک ہی موڈ میں، یا اپنی مرضی کے مطابق مختلف موڈوں میں بڑی کامیابی اور نفاست کے ساتھ باتیں کر سکتی ہوں اور اس سارے دوران میں مجھے برابر یہ خیال رہتا ہے کہ یہ شخص، یہ خوب صورت اور پرکشش اور ذہین مرد مجھ سے مرعوب ہو رہا ہے، میرے قبضے میں آ رہا ہے، میرے قبضے میں آچکا ہے، مسحور ہو چکا ہے۔ اب یہ میرے بس میں ہے کہ اسے رکھوں یا چھوڑ دوں، اٹھالوں یا گرا دوں یا اس کا دل توڑ دوں۔ اس سارے دوران میں مجھے برابر یہ خیال رہتا ہے کہ یہ شخص اعلیٰ ہے اور میں ادنیٰ ہوں، چنانچہ اسے میرے نزدیک نہیں آنا چاہیئے، اس کو میری حقیقت کا علم نہیں ہونا

چاہیئے ورنہ یہ مجھے چھوڑ دے گا۔ اس سے پہلے میں اپنی پوزیشن مضبوط
کروں گی، میں اپنی ساری مرکب شخصیتیں، اپنا سارا ذہن، اپنا سارا فن
استعمال کروں گی، اسے مرعوب کروں گی، اسے چھوڑ دوں گی۔ پیشتر اس
کے کہ یہ مجھے تباہ کر دے، میں اسے تباہ کر دوں گی۔ یہ میری زرہ بکتر ہے
میری زندگی ہے اور حد یہ ہے کہ میں اس ساری بات کو جانتی بھی ہوں۔ آج
تک میری اپنے آپ سے، یا دنیا سے، مکمل صلح نہیں ہو سکی ہیں نے بڑے
خلوص سے کوشش بھی کی ہے۔

میں یہ سب کچھ تمہیں اس لئے نہیں بتا رہی کہ تم کوئی پادری ہو اور
میں اقبال جرم کے لئے آئی ہوں۔ میں پادریوں سے بھی مل چکی ہوں۔
پادری احمق ہوتے ہیں اور انھوں نے طوطے کی طرح اپنا سبق رٹا ہوا
ہوتا ہے۔ وہ بھی میری طرح اپنی شخصیت پر خول چڑھا کر رکھتے ہیں، چنانچہ
بے اثر ہوتے ہیں اور ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں یہ سب کچھ اس
لئے بتا رہی ہوں کہ تم سے شاید دوبارہ ملاقات نہ ہو اور میں نہیں چاہتی کہ
تم میرے بارے میں اوٹ پٹانگ سوچتے رہو۔ ہم بڑے اچھے لوگ ہیں،
اور ہم نے بڑی مضبوط اور خوش حال سوسائٹی بنائی ہے اور اس پر
نازاں ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں
کر سکتے، جو سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر سب آخری تجزیے میں یہ پتہ چلتا

ہے کہ ہم کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

میں اس کی آواز، اس کے الفاظ کے سحر سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے"۔ وہ پھر بولی "کہ آج تک میرو کے علاوہ کسی مرد نے مجھے متاثر نہیں کیا اور میرو نے خود ہی میرے قریب آنے سے احتراز کیا۔ اس نے مجھ پر بڑا احسان کیا اور میں اس کی بڑی شکر گزار ہوں۔ لیکن سلطان! میں اس شخص سے ڈرتی ہوں جو ایک روز آئے گا جسے میں نظر انداز نہ کر سکوں گی۔ پھر میں کیا کروں گی سلطان؟"

"بلانکا!" میں کھنکارا۔ "مجھے پتہ نہیں تم کیا کرو گی۔"

"تمہیں پتہ نہیں میں کیا کروں گی؟" اس نے سہم کر دہرایا۔

میں نے دوبارہ گلا صاف کیا "بلانکا میں نے ایک دفعہ تم سے کہا تھا کہ ہم لوگوں میں دوست لڑکیوں کو چومنے کا رواج نہیں ہے لیکن....." میں رک گیا۔

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بڑے دکھ بھرے پیار سے مسکرائی۔ "رواج کو توڑنا چاہتے ہو پاگل آدمی؟" پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ میری طرف اٹھا دیا۔

جب ہم باہر نکل رہے تھے تو اسٹیڈیم کے دروازے پر کھڑے

ہوئے مزدوروں نے میری سرخی مائل سنہری داڑھی اور سیاہ سر اور گندمی رنگت کو، اور بلا نکا کے سفید بالوں کو اور ہمارے گہرے اداس خاموش چہروں کو اچنبھے اور تمسخر سے دیکھا۔ کیمپس کا راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ گرجے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا "سلطان لوگ عبادت کرتے ہیں تاکہ خدا کو پا سکیں، میں خدا کی تلاش میں ہوں تاکہ محبت کر سکوں۔ اپنی جگہ ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ مجھے چومو۔"

تم ٹھیک کہتی ہو محبوب لڑکی، میں نے کہنا چاہا، لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا صرف آہستہ سے شب بخیر کہہ کر چلا آیا۔

پھر آخری منظر آتا ہے۔ آخری منظر، جو سب سے زیادہ قریب سب سے زیادہ شوخ اور گہرا ہوتا ہے اور تیزی سے نکل جاتا ہے یونی ورسٹی ٹاؤن کا چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن اور تین محبوب چہرے ہیں اور میرا سامان رکھا جا چکا ہے اور لمبا سا سبز ٹکٹ میرے ہاتھ میں ہے۔

اور بائرن کہتا ہے "جب میں اپنا ذاتی آرکسٹرا لے کر عالمی دورے پر آؤں گا تو صرف تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لئے اسپیشل پرفورمنس دوں گا۔ رائل کمانڈ پرفورمنس"۔

اور بلا انکا کہتی ہے "یاد رکھنا ایک نہ ایک روز میرا جہاز تمہارے ساحل پر آ لگے گا۔ میرا انتظار کرنا۔" اور جین محض خاموش کھڑی اپنے نیلے تبسم کے ساتھ دیکھے جاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو "ہم بڑے اچھے لوگ ہیں، ہمیں یاد رکھنا۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔"

پھر ہاتھ ملتے ہیں اور رومال ملتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہرے اداس ہو جاتے ہیں، پھر مسکراتے ہیں، پھر اداس ہو جاتے ہیں، پھر ہجوم میں غائب ہو جاتے ہیں، پھر باہر نکل آتے ہیں، پھر دور ہو جاتے ہیں، پھر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ گاڑی پہاڑ کا موڑ کاٹتی ہے اور سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے۔

چند ماہ تک بلا انکا کے خط آتے رہتے ہیں، پھر بند ہو جاتے ہیں۔ بائرن کا خط کبھی کبھار آ جاتا ہے۔ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ بلا انکا ایک یوکرائینی لڑکے میں شدت سے دل چسپی لے رہی ہے۔ پھر اطلاع ملتی ہے کہ دونوں نے شادی کا اعلان کر دیا ہے اور بلا انکا بڑی خوش ہے۔ مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر بائرن کا کئی ماہ تک خط نہیں آتا۔ پھر آج اس کا آخری خط موصول ہوتا ہے جسے جیب میں رکھ کر میں باہر نکل آتا ہوں اور خزاں کی سہ پہر کے پرسکوت سحر کو محسوس کرتا ہوں اور سامنے والے کھیت میں دنیا کے سب سے دلگداز منظر کو

دیکھتا ہوں اور ندی پر جھک کر اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔
اب ندی کے پُل پر شام پڑ رہی ہے اور بہت سارا وقت منظر منظر کر کے پانی میں بہتا ہوا گزر گیا ہے۔ اب کسان یہاں سے جا چکا ہے اور درختوں میں رکی ہوئی ہوا چلنے لگی ہے اور یاد کرتے ہوئے دل کا خوف اترتا جا رہا ہے۔ میں خط کو جیب سے نکالتا ہوں اور دن کے آخری اُجالے میں اسے آنکھوں کے قریب لاتا ہوں۔

"شادی سے دو ہفتے قبل وہ 'نیاگرا' گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے مجھے اور جین کو پکچر کارڈ بھیجے۔ شام کو جان بچانے والوں کے دستے نے دو گھنٹے کی تلاش کے بعد دریا میں سے اس کی لاش برآمد کی۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق وہ ریلنگ پر بیٹھی تصویریں لے رہی تھی کہ پھسل کر آبشار میں جا گری۔ موت حادثاتی طور پر عمل میں آئی۔ میں نے اور جین نے بہرحال ہنی مون کے لئے 'نیاگرا' جانے کا خیال ترک کر دیا ہے۔

خدا حافظ۔ تمہارا : ڈیوڈ۔ ایف بائرن "

میں ایک ایک سطر کو پڑھتا ہوں اور ایک ایک لفظ کو پڑھتا ہوں حتیٰ کہ اندھیرا میری نظر کے راستے کو روک دیتا ہے اور خوف کا سایہ میرے دل پر سے اُتر جاتا ہے۔ ایک یاد مکمل ہوئی، ایک یاد ساتھ چھوڑ گئی۔
اب میں آزاد ہوں اور مستقبل کی طرف سفر کرتا ہوں۔ مستقبل جو فراموشیوں

کی آماجگاہ ہے، جہاں وہ سب، جو دنیا میں خالص ہے اور خوبصورت ہے اور نازک ہے اور نوجوان ہے اور دلیر ہے، خام اور بھولا بن جاتا ہے ٹوٹ کر گر پڑتا ہے، پیچھے رہ جاتا ہے، بھلا دیا جاتا ہے، اور گو اس کرۂ ارض پر ساری انسانی آبادی کی پیدائش محض حادثاتی نوعیت کی ہے لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی پیدائش کے حادثے کو نہیں بھلا سکتے جو اپنے خلوص اور ذہانت اور اپنے حسن اور اپنی دیانت داری کو یکجا رکھنے کی خاطر بہادری سے کھڑے رہتے ہیں اور کھڑے رہتے ہیں اور بالآخر اپنی اعلیٰ تر یاد کی سفاکی کے مقابل ناپائدار ثابت ہوتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ یہ لوگ زمانے کا ضمیر ہیں جو اپنے رویے سے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسانی حافظے سے محو کر دیے جاتے ہیں۔ یہ وقت کا ظلم ہے جس پر ہم قادر نہیں ہیں، جس کی برابری صرف ہماری ادنیٰ یاد کی رحمدلی کرتی ہے۔

میں پُل پر جھک کر کھڑا کھڑاتا ہوا کاغذ آہستہ سے ندی میں گرا دیتا ہوں۔ پانی کی سطح پر اندھیرا اُتر آتا ہے۔ اس میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ تم اکیلی ہی نہیں ہو — بلانکا!

قابلِ مطالعہ کتابیں

● ادب و تنقید

عرضِ ہنر ... ... ڈاکٹر محمد حسن
افکارِ سودا ... ... ڈاکٹر شارب ردولوی
فلسفہ اور ادبی تنقید ... ... ڈاکٹر وحید اختر
تلاش و توازن ... ... ڈاکٹر قمر رئیس

● افسانے

بیس نئی کہانیاں ... ... علی احمد فاطمی
سب سے چھوٹا غم ... ... عابد سہیل
بِچا ہوا البم ... ... اقبال متین

● ناول

آدھا راستہ ... ... کرشن چندر
داراشکوہ ... ... قاضی عبد الستار
چار چہرے ... ... سُہیل عظیم آبادی

● شاعری

سیلِ وجود ... ... ساجدہ زیدی
بھیگی زمین ... ... احسن رضوی
جاناں جاناں ... ... احمد فراز